قومی کمیٹی برائے تقریبات صد سالہ جشن ولادت
علامہ محمد اقبال



علامہ محمد اقبالؒ

۱۸۷۷ - ۱۹۳۸ء

علّامہ محمّد اقبالؒ

۱۸۷۷ — ۱۹۳۸ء

از

احمد ندیم قاسمی

نیشنل کمیٹی برائے تقریباتِ صد سالہ جشنِ ولادت
علّامہ محمّد اقبالؒ

ناشر

مجلسِ ترقیِ ادب ۔ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع اوّل : نومبر ۱۹۷۷ء

☆

ناشر : **احمد ندیم قاسمی**
ناظم مجلس ترقی ادب ، کلب روڈ ، لاہور

طابع : **اغفیر احمد**

مطبع : **سمیر پرنٹرز**، ۴ رائل پارک ، لاہور

سرورق : **فنون پریس**، رائل پارک ، لاہور

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال

جب کسی قوم کے بھلے دن آتے ہیں تو پہلے اس کے دل میں اپنی پستی اور تباہ حالی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت اس ملّتِ خوابیدہ کا ایک فرد بیدار ہو کر "بانگِ درا" سے اس ساکت و صامت کارواں کو شاہراہ ترقی پر ڈال کر سر گرمِ عمل وجستجو کر دیتا ہے۔ چنانچہ ایک وقت آیا جب جمود و خمود کے وہ آثار و نقوش، جو تمام دنیا کے مسلمانوں پر طاری و ساری تھے، ملّتِ بیضا کے ہر فرد کو نظر آنے لگے اور دنیائے اسلام کے ہر خطے میں ایسے قائدین پیدا ہوئے جن کی عقلِ رسا اور فہمِ دراک نے ملّت کو ترقی کے صحیح راستے پر لا کھڑا کیا اور مردہ رگوں میں زندگی کا خون دوڑا کر منزلِ مقصود کی طرف گامزن کر دیا۔

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ایسے ہی کارواں سالار تھے جن کے درد بھرے ترانوں، پرسوز نالوں اور حیات افروز پیغام نے قوم کے حق میں صورِ اسرافیل کا کام کیا اور ان کی شعلہ نوائیوں نے لوگوں کے یخ بستہ جذبات کو گرما دیا۔

اقبال کے اسلاف:

اقبال کے آبا و اجداد کشمیری پنڈتوں کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، جو سلطان زین العابدین عرف بڈ شاہ کے عہد ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء تا ۸۷۷ھ/۱۴۷۳ء میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آپ کے دادا کشمیر سے ہجرت کرکے پنجاب آئے اور سیالکوٹ میں آباد ہوئے۔ آپ کے خاندان کی ایک شاخ اب تک کشمیر میں موجود ہے اور "سپرو" کہلاتی ہے۔ اس لفظ سے وہ شخص مراد ہے جس

نے سب سے پہلے پڑھنا سیکھا ، یا جس نے پڑھنے میں سبقت کی ۔ اقبال کے والد بزرگوار کہتے تھے کہ یہ نام کشمیر کے برہمنوں نے اپنے آن بھائی بندوں کو از راہ تعریض و تحقیر دیا تھا جنھوں نے قدیم رسوم و تعلقات قومی و مذہبی کو چھوڑ کر سب سے پہلے اسلامی زبان و علوم سیکھنا شروع کیے ۔ رفتہ رفتہ یہ نام ایک مستقل گوت ہو کر مشہور ہو گیا ۔ کشمیری پنڈتوں کی ذہانت و فطانت اور فلسفہ‌دانی سے کسے انکار ہو سکتا ہے ۔ غالباً ازروئے قانونِ توارث اقبال کو اس سے اچھا خاصا حصہ ملا تھا ۔ اقبال اس کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

مرا بنگر کہ در هندوستاں دیگر نمی بینی
برهمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

یا

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند
جز برهمن پسرے محرمِ اسرار کجاست

۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو اقبال ایک خط کے ذریعے اپنے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد کو یہ مژدہ سناتے ہیں :

"آپ اور والدِ مکرّم یہ سن کر خوش ہوں گے کہ ملت کی جستجو کے بعد اپنے بزرگوں کا سراغ مل گیا ہے ۔ حضرت بابا لولی حج ، کشمیر کے مشہور مشائخ میں سے تھے ۔ اُن کا ذکر خواجہ اعظم کی "تاریخ کشمیر" میں اتفاقاً مل گیا ہے ۔ والدِ مکرّم نے جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا تھا وہ بحیثیت مجموعی درست ہے ۔ ان کا اصلی گاؤں لوچر نہ تھا بلکہ موضع چکّو پرگنۂ اڈون تھا ۔ بارہ سال کشمیر سے باہر رہے اور ممالک کی سیر میں مصروف رہے ۔ بیوی کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہ تھے ، اس واسطے ترکِ دنیا کر کے کشمیر سے نکل گئے ۔ واپس آنے پر اشارۂ غیبی پا کر حضرت بابا نصرالدین کے مرید ہوئے جو حضرت نورالدین ولی کے مرید

تھے ۔ بقیہ عمر انھوں نے بابا نصرالدین کی صحبت میں گذاری اور اپنے مرشد کے جوار میں مدفون ہیں ۔ اب امید ہے کہ مزید حالات معلوم ہو جائیں گے۔ . . ۔ غالباً بابا نصرالدین کی اولاد کشمیر میں ہوگی ۔ ان سے مزید حالات معلوم ہونے کی توقع ہے ، اور کیا عجب کہ ان کے پاس اپنے مریدوں کا سارا سلسلہ موجود ہو۔"

معروف پاکستانی محقّق مولوی محمد عبداللہ قریشی نے اقبال کے بزرگوں کے بارے میں کچھ کھوج لگانے کی کوشش کی ہے ۔ ان کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ حضرت شیخ نورالدین ولی کے خلیفہ بابا نصرالدین کے مریدوں میں ایک بزرگ تھے ، جن کا اصل نام تو معلوم نہیں ہو سکا ، لیکن ان کے متعلق "واقعاتِ کشمیر" (تاریخ اعظمی) مصنفۂ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کے صفحہ ۲۷ پر لکھا ہے کہ وہ بارہ سال کشمیر سے باہر سیر و سیاحت میں رہے اور انھوں نے کئی حج پاپیادہ کیے ۔ اس وجہ سے انھیں بابا لول حج یا لولی حاجی کہتے تھے ۔ ان کا وطن پرگنۂ اڈون کا موضع چکّو تھا جو تحصیل کولگام میں واقع ہے ۔ قبولِ اسلام سے قبل ذات کے برہمن تھے، گوت سپرو اور پیشہ زمینداری تھا ۔ یہ سپرو خاندان کے اُن اولین بزرگوں میں سے تھے جو مسلمان ہوئے ۔ اُنھوں نے فقر اختیار کرنے کے بعد سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پیر کا آستانہ سَل لیا اور انتقال کے بعد بھی چرار شریف میں احاطۂ مزار شیخ نورالدین ولی ریشی کے اندر اپنے مرشد بابا نصرالدین کے پہلو میں جگہ پائی ۔

بابا لولی حج کے جانشینوں کے سلسلے میں شیخ محمد اکبر ایک باعمل صوفی تھے جن کے تقدس کا بڑا شہرہ تھا ۔ اُنھوں نے کئی دفعہ پنجاب کا سفر بھی کیا ۔ مرشد نے ان کی شرافت و نجابت کی بنا پر ان کی شادی اپنی صاحب زادی سے کر دی ۔ شیخ کے وصال کے بعد وہی ان کے خلیفہ مقرر ہوئے ۔

ان کی چوتھی پشت میں چار بھائی شیخ محمد رمضان ، شیخ محمد

رفیق اور شیخ عبداللہ وغیرہ افغانوں کے عہد میں کشمیر سے ہجرت کرکے پنجاب آئے اور سیالکوٹ میں مقیم ہوئے ۔ ان کے والد چونکہ کشمیر ہی میں رہے اس لیے سیالکوٹ میں کسی کو ان کا حال نہ معلوم ہو سکا ۔

شیخ محمد رمضان سب سے بڑے تھے ۔ انھوں نے تصوف پر فارسی زبان میں چند کتابیں لکھ کر اپنی صوفی مشربی کا ثبوت دیا ۔ ان کی تین لڑکیوں کے سوا کوئی نرینہ اولاد نہ تھی اس لیے سلسلہ آگے نہ چلا ۔

دوسرے بھائی شیخ محمد رفیق نے سیالکوٹ میں بزازی کی دوکان کھولی اور ان کے فرزندِ اکبر شیخ نور محمد نے بھی اپنے والد کی دکان پر ہی کام کیا ۔ شیخ عطا محمد اور علامہ اقبال انھی کے فرزند تھے ۔ شیخ محمد رفیق کے فرزندِ دوم شیخ غلام محمد محکمۂ انہار میں ملازم ہو کر روپڑ میں مقیم تھے کہ شیخ محمد رفیق اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے روپڑ گئے ۔ وہیں بیمار ہوئے اور انتقال کر گئے ۔ چنانچہ اقبال کے دادا کی آخری آرامگاہ روپڑ میں ہے ۔

تیسرے بھائی شیخ عبداللہ نے ضلع سیالکوٹ کے موضع جیٹھےکی میں بود و باش اختیار کی ۔ ان کی اولاد میں سے اکثر لوگ ریاست حیدرآباد میں چلے گئے اور وہیں زراعت میں مشغول ہوگئے ۔

سب سے چھوٹے بھائی کا نام معلوم نہیں ہو سکا ۔ انھوں نے لاہور میں سکونت اختیار کی اور لاولد ہی فوت ہوئے ۔

اقبال کے والدِ بزرگوار شیخ نور محمد کی کنیت ناک چھدنے کی وجہ سے شیخ نتھو تھی ۔ وہ بڑے وجیہ ، اچھے قد آور ، نہایت خوش پوش اور خوش ذوق انسان تھے ۔ تجارت پیشہ ہونے کے باوصف صوفیا اور علما کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے سے شریعت و طریقت کے رموز و نکات کو خوب سمجھتے تھے اور علمِ مجلس سے اچھی طرح واقف تھے ۔ اپنے شوق سے کچھ لکھنا پڑھنا بھی سیکھ گئے تھے ۔ ان پر تصوف و روحانیت کی گہری چھاپ تھی ۔ علامہ اقبال



علامہ اقبال کے والد گرامی شیخ نور محمد مرحوم
(وفات : ۱۷ ۔ اگست ۱۹۳۰ء)

کے استاد مولوی میر حسن انھیں "ان پڑھ فلسفی" کہا کرتے تھے ۔ یہی رنگ اقبال میں علم و حکمت اور شعر و ادب کے جوہروں کے ساتھ مل کر بہت گہرا ہو گیا تھا ۔ اقبال اپنے والد ماجد کے روحانی مدارج کے کئی دلچسپ واقعات سنایا کرتے تھے ۔ وہ قرآن مجید کی تلاوت کو دین و دنیا کی ترقی کا باعث خیال کرتے تھے اور اقبال کو ہمیشہ یہی تلقین کیا کرتے تھے کہ بیٹا ! قرآن پاک اس طرح پڑھا کرو گویا وہ تمھی پر نازل ہو رہا ہے یا خدا تم سے ہم کلام ہے ۔ اقبال کی طبیعت میں گداز قرآن پاک کی تلاوت ہی کا نتیجہ تھا ۔

شیخ نور محمد نے بڑی لمبی عمر پائی ۔ اقبال کی ہر دل عزیزی کا عروج اپنی آنکھوں سے دیکھا ۔ اسّی برس کے سن میں آنکھوں میں موتیا اتر آیا تھا اور بصارت جاتی رہی تھی ۔ وہ سو برس کے قریب عمر پا کر ۱۷ اگست ۱۹۳۰ء کو سیالکوٹ میں فوت ہوئے ۔ اقبال نے یہ قطعۂ تاریخ لکھا جو امام صاحب کے قبرستان میں مرحوم کی قبر پر کندہ ہے :

پدر و مرشدِ اقبال ازیں عالم رفت
ما ہمہ راہرواں ، منزلِ ما ملکِ ابد
ہاتف از حضرتِ حق خواست دو تاریخ رحیل
آمد آواز اثرِ رحمت و آغوش لحد

۱۳۴۹ھ ۱۳۴۹ھ

اس سے پندرہ سولہ سال قبل ۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو جب اقبال کی والدۂ ماجدہ فوت ہوئیں اور اقبال نے نہایت پُر درد نظم "والدۂ مرحومہ کی یاد میں" لکھی تو حضرت اکبرالہ آبادی نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے جو اشعار کہے تھے، اُن میں والدین کی تربیت کے اثرات پر خاص طور سے اشارہ ملتا ہے :

حضرتِ اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جو ان کے طرز کی شیدا ہوئیں

یہ خود آگاہی ، یہ خوش گوئی ، یہ ذوقِ معرفت
یہ طریقِ دوستی ، خود داریٔ باَ تمکنت
اس کی شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
باخدا تھے ، اہلِ دل تھے ، صاحبِ اسرار تھے
جلوہ گر ان میں انہی کا ہے یہ فیضِ تربیت
ہے ثمر اس باغ کا یہ طبعِ عالی منزلت
روکنا مشکل ہے آہ و زاری و فریاد کو
نعمتِ عظمٰی ہے ماں کی زندگی اولاد کو
مادرِ مرحومۂ اقبال جنّت کو گئیں
چشم تر ہے آنسوؤں سے ، قلب ہے اندوہ گیں
اکبر اس غم میں شریکِ حضرتِ اقبال ہے
سالِ رحلت کا یہاں منظور اسے فی الحال ہے
واقعی مخدومۂ ملّت تھیں وہ نیکو صفات
"رحلتِ مخدومہ" سے پیدا ہے تاریخِ وفات

۱۳۳۳ھ

حضرت اکبر الہ آبادی ہی کا یہ قطعۂ تاریخِ وفات مرحومہ کے لوحِ مزار پر کندہ ہے :

مادرِ مخدومۂ اقبال رفت سوئے جنت زیں جہانِ بے ثبات
گفت اکبر با دلِ پر درد و غم "رحلتِ مخدومہ" تاریخِ وفات

۱۳۳۳ھ

عرفان و تقویٰ اور آدابِ اسلامیت کی یہی پُر سعادت فضا تھی جس کی آغوش میں اقبال نے تربیت پائی تھی ۔ اس بنا پر آپ نے اپنے فرزند جاوید اقبال کو یہ وصیت فرمائی :

غارت گرِ دیں ہے یہ زمانہ ہے اس کی نہاد کافرانہ
خالی ان سے ہوا دبستاں تھی جن کی نگاہ تازیانہ
جس گھر کا مگر چراغ ہے تو ہے اس کا مذاق عارفانہ



علامہ اقبال کی والدۂ گرامی (وفات : ۹ نومبر ۱۹۱۴ء)

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈھ وہ فقر   جس فقر کی اصل ہے حجازی
مومن کی اسی میں ہے امیری   اللہ سے مانگ یہ فقیری

ولادت اور تعلیم :

اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ یہ وہی شہر ہے جس کی خاکِ پاک سے علامہ عبدالحکیم جیسا فاضلِ یگانہ پیدا ہو چکا ہے۔ اقبال کی پیدائش دراصل ملّت بیضا کے ظہورِ اقبال کا مژدۂ جاں‌فزا تھی :

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہانِ مجبور
خود گرے ، خود شکنے ، خود نگرے پیدا شد

یعنی : جب صورت گرِ کائنات نے انسان کو تخلیق کیا تو عشق پکار اٹھا کہ وہ عاشقِ صادق آ گیا جو محبت میں خونِ جگر سے کشتِ وفا سینچے گا۔

حسن اس اندیشے سے لرز گیا کہ یہ اتنا باریک بیں اور دور رس ہوگا کہ جلوۂ صورت کی رنگینی اور ظاہری چمک دمک کے پیچھے چھپی ہوئی ناپائیداری اور بے ثباتی کی بے رنگی بھی دیکھ لے گا۔

فطرت اس خیال سے پریشان ہوگئی کہ مشیّت ایزدی کے حکم سے بندھے ، بے بس اور مجبورِ عالمِ عناصر کی بے جان خاک سے ایک ایسا صاحبِ اختیار پیدا ہوگیا ہے جو اپنے کردار اور عمل سے اپنی تقدیر خود بنائے گا اور اپنی قاہرانہ قوتوں کی سرکشی سے اپنا رشتۂ حیات خود ہی پاش پاش کر دے گا۔ یعنی وہ زمین پر فساد پھیلائے گا اور اپنی فراست سے اپنے جسدِ عنصری کے تاریک پردوں میں پوشیدہ عروج و ارتقا کی تابناک صلاحیتوں کا مشاہدہ کرے گا۔

دو بھائیوں اور چار بہنوں میں اقبال سب سے چھوٹے تھے۔ مکتب کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اقبال نے سکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ سے ۱۸۹۳ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر



سیالکوٹ میں علامہ اقبال کا آبائی مکان

سکاچ مشن کالج میں داخل ہو کر دیگر علوم و فنون کی تحصیل کے علاوہ فارسی اور عربی شمس العلماء مولانا سید میر حسن سے پڑھی۔ مولانا مرحوم عربی اور فارسی نظم و نثر کے متبحّر عالم، اسلامیات کے سچے شیدائی اور نہایت نیک خصلت اور پاک منش بزرگ تھے۔ آپ کے فیضِ صحبت سے اقبال "ذوقِ تپش" سے آشنا ہوئے اور ان کا وہ جوہر جگمگا اٹھا جو فطرتاً ان کی طبیعت میں موجود تھا۔ آپ نے شعر کہنے شروع کیے، اُستاد نے حوصلہ بڑھایا اور آپ کی شاعری تھوڑے ہی عرصے میں اکثر تلامذہ کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ آپ نے خط و کتابت کے ذریعے فصیح الملک نواب میرزا داغ دہلوی کو اپنا کلام دکھایا اور اپنے شفیق اساتذہ کی نوازشوں کو ہمیشہ یاد رکھا۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں جب آپ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان روانہ ہوئے تو اپنی نظم "التجائے مسافر" میں علم و عمل کی ارزانی کی دعا مانگنے اور ایک سعادت مند فرزند کی طرح "قدمِ مادر و پدر پہ جبیں" رکھنے کی آرزو کے ساتھ شمس العلماء مولانا سید میر حسن سے عقیدت و محبت کا اظہار مندرجہ ذیل اشعار میں کیا:

وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

اسی طرح بعض دوسری نظموں میں حضرت داغ دہلوی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حالی پانی پتی اور مولانا گرامی کی تعریف کی۔

۱۸۹۵ء میں سیالکوٹ سے ایف۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے جہاں سے ۱۸۹۷ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اسی جگہ آپ نے پروفیسر ڈاکٹر آرنلڈ سے فلسفہ اور حکمت کا درس لیا اور اپنی خداداد ذہانت اور

قابلیت کا پورا پورا ثبوت دیا ۔ ڈاکٹر آرنلڈ لاہور آنے سے قبل علی گڑھ کالج کی پروفیسری کے زمانے میں مولانا شبلی پر اپنی قابلیت کا اثر ڈال چکے تھے۔ یہاں انھیں اقبال جیسا جوہر قابل نظر آیا جسے چمکانے میں انھوں نے خوشی محسوس کی ۔ وہ فلسفۂ جدید کے علاوہ ادبیات عرب اور اسلامیات کے بھی ماہر تھے ۔ ان کی شہرۂ آفاق کتاب "پریچنگ آف اسلام" اُس کی شاہدِ عادل ہے ۔ ان کی توجہ سے اقبال نے کافی ترقی کی ۔ وہ اقبال کی علمی تحقیقات کی دل سے قدر کرتے تھے اور ان کی فلسفیانہ موشگافیوں کی داد دے کر ان کا حوصلہ بڑھاتے تھے ۔

انھی دنوں ایک غیر معمولی واقعے نے اقبال کو بے حد پریشان



مسجد مولوی میر حسن مرحوم (سیالکوٹ) جہاں علامہ اقبال نے ابتدائی تعلیم حاصل کی

کیا ۔ ایک مولوی صاحب نے ، جو عالمِ دین بھی تھے ، خلافِ توقع جھوٹ بولا ۔ اقبال یہ دیکھ کر بے قرار ہو گئے اور کئی دن تک اس مسئلے پر بے چینی کے عالم میں غور کرتے رہے ۔ پڑھائی چھوٹ گئی، طبیعت اُچاٹ ہو گئی ، کسی کام میں جی نہ لگتا ۔ پروفیسر آرنلڈ نے یہ بے توجہی دیکھی تو اس کا سبب دریافت کیا ۔ اقبال نے وہ تمام واقعہ من و عن کہہ سنایا ۔ پروفیسر آرنلڈ نے نہایت ہمدردی سے آپ کی اُلجھن دور کی اور فرمایا : "آیندہ زندگی میں آپ کو اس قسم کے بے شمار واقعات سے سابقہ پڑے گا ۔" انھی باتوں سے اقبال کی شہرتِ علمی کا چرچا دور دور تک ہونے لگا ۔ خود ڈاکٹر آرنلڈ نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ ایسا شاگرد اُستاد کو محقق بنا دیتا ہے ۔
اس نمایاں کامیابی پر اپنے فاضل استاد کے متعلق جو جذبات تشکّر و امتنان آپ کے دل میں پیدا ہوئے ، اُن کا اظہار اقبال نے "نالۂ فراق" کے عنوان سے پروفیسر آرنلڈ کے ۲۶ فروری ۱۹۰۴ع کو مستعفی ہو کر یورپ چلے جانے کے بعد مندرجہ ذیل اشعار میں کیا :

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں
آہ ! مشرق کی پسند آئی نہ اُس کو سرزمیں
آ گیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقیں
ظلمتِ شب سے ضیائے روزِ فرقت کم نہیں

"تا ز آغوشِ وداعش داغِ حیرت چیدہ است
همچو شمعِ کشتہ درچشمِ نگہ خوابیدہ است"

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا
آئنہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا
نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا
آہ ! کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا

"ابر رحمت دامن از گلزار من برچید و رفت
اندکے برغنچہ ہائے آرزو بارید و رفت"

کھول دے گا دستِ وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو
دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو
کیا تسلی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو
"تابِ گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا"

اور جب تک پنجاب کی زنجیریں توڑ کر خود بھی انگلستان نہ پہنچ گئے ، تسلی نہ ہوئی ، ان کی روح کو چین نہ آیا ۔

شہرت کا آغاز :

قیامِ لاہور کے زمانے میں آپ کی شاعری منظرِ عام پر آئی اور آپ عام مشاعروں میں شریک ہو کر دادِ سخن دینے لگے ۔ خیالات میں چونکہ جدّت اور نیا پن تھا ، اس لیے آپ کا کلام بے حد پسند کیا جاتا تھا ۔ ایک دفعہ تو آپ کا یہ شعر حاصلِ مشاعرہ قرار پایا :

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

پھر جب آپ نے مذاقِ زمانہ اور مقتضائے وقت کے مطابق انگریزی نظموں اور خیالات کو اُردو کا جامہ پہنانا شروع کیا تو آپ کی اس کوشش کو بہت سراہا گیا ۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ پہلے اورینٹل کالج لاہور میں میکلوڈ عربک ریڈر اور بعد میں گورنمنٹ کالج اور اسلامیہ کالج لاہور میں فلسفے اور انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے ۔ انھی دنوں آپ نے معاشیات پر ایک کتاب "علم الاقتصاد" لکھی ۔ یہ سب سے پہلی مستند کتاب ہے جو اس موضوع پر اُردو زبان میں لکھی گئی ۔

ایم ۔ اے کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اقبال نے لاء کی کلاس میں بھی داخلہ لیا مگر امتحان کے ایک پرچے میں فیل ہوگئے ۔ ۱۹۰۱ء میں آپ پنجاب کے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے امتحانِ مقابلہ میں شریک ہوئے مگر میڈیکل بورڈ نے آپ کو طبّی نقطۂ نگاہ سے نااہل قرار



علامہ اقبال کے زمانۂ شباب کی ایک تصویر

دے دیا حالانکہ اپ کی صحت بہت اچھی تھی ۔ اس بے انصافی کے خلاف بعض اخبارات نے زبردست احتجاجی نوٹ لکھے۔ یورپ جا کر پی ایچ ۔ ڈی اور بیرسٹری کرنے کا خیال آپ کو اسی ناکامی کی وجہ

سے آیا ۔

اسی زمانے میں اقبال نے انجمن کشمیری مسلمانان اور انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں کے لیے وہ غیر فانی نظمیں لکھیں جن کے باعث آپ کی شہرت پر لگا کر اڑنے لگی ۔ پھر "مخزن" کے صفحات پر پے در پے نظمیں چھپیں جو بے حد مقبول ہوئیں اور سارا ہندوستان آپ کے نام سے گونج اٹھا ۔ "اقبال کا ترانہ"، "نیا شوالہ" اور دیگر قومی نظموں نے ملک میں بیداری کی ایک عام لہر دوڑائی اور سب نے آپ کو قومی بیداری اور نشاۃِ ثانیہ کا نقیب اور ترجمانِ حقیقت تسلیم کر لیا ۔

تعلیمی سفر :

۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کو اقبال انگلستان روانہ ہوئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفے کی سند حاصل کی ۔ پھر یورپ کے مختلف ممالک کی سیر کرتے ہوئے جرمنی پہنچے اور "فلسفۂ عجم" پر ایک محققانہ مقالہ لکھ کر میونک یونیورسٹی سے پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔ جرمنی سے واپس آ کر آپ لندن سکول آف پولیٹیکل سائنس میں داخل ہوئے اور بیرسٹری کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا ۔

قیامِ انگلستان کے زمانے میں آپ پروفیسر ڈاکٹر میک ٹیگرٹ سے بے حد متاثر ہوئے ۔ اقبال کی رائے تھی کہ میک ٹیگرٹ کا فلسفہ ایک خاص قسم کا تصوف تھا جس نے عقل کی روشنی میں ان کو یزداں شناسی کا راستہ دکھایا ۔ پروفیسر نکلسن اور پروفیسر براؤن سے تو آپ کی خاصی دوستی ہو گئی ۔ مؤخر الذکر دونوں حضرات مشرق ادبیات کے زبردست ماہر اور نقاد تھے ۔ ان کی دوستی کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ اقبال کو فارسی ادبیات اور دیگر اسلامی علوم کے مطالعے کا موقع مل گیا ۔ دوسرے اسلامی تہذیب اور مغربی تمدن کے موازنے نے ان کی آنکھیں کھول دیں ۔ تیسرے ان کا علم اتنا وسیع اور زبان اتنی پختہ ہو گئی کہ وہ عہد نو کے شاعر کی حیثیت



علامہ اقبال اور عطیہ فیضی

سے شاعری اور پیغمبری کی دوگونہ صفات سے متّصف ہوئے۔ اُنھوں نے اسلامی اصولوں کی علم برداری کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے کر اپنے جذبات و افکار کے اظہار کے لیے ایک نئی راہ تلاش کی۔ پہلے وہ فطرت سے محبت کرنے کی تعلیم دیتے اور مظاہرِ قدرت میں انوارِ ربّانی کا مشاہدہ کرتے تھے، پھر وہ پیکرِ انسانی میں صفاتِ الٰہی کے جلوے دیکھنے دکھانے لگے۔ اور چوتھا فائدہ یہ ہوا کہ پروفیسر نکلسن نے بعد میں آپ کی مثنوی "اسرارِ خودی" کو انگریزی زبان میں منتقل کرکے آپ کو سارے یورپ اور امریکہ میں روشناس کرادیا۔

اسی جگہ آپ نے اسلام پر چند مقالات پڑھے جن سے آپ کی مذہبی تحقیقات کی دھوم مچ گئی۔ پروفیسر ڈاکٹر آرنلڈ چند ماہ کی



ھائیڈل برگ (جرمنی) میں علامہ اقبال اور اُن کے بعض رفقا
اپنی "لینڈ لیڈی" کے ساتھ

رخصت لے کر مصر تشریف لے گئے تو لندن یونیورسٹی نے اقبال کو ان کی جگہ قائم مقام عربی پروفیسر مقرر کیا ۔

مراجعت :

تدریس کے چھ ماہ گزار کر اقبال ہندوستان واپس آئے اور ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو پیر کے روز لاہور پہنچے تو معززینِ لاہور نے آپ کا پرتپاک خیرمقدم کیا ۔ استقبال کرنے والے دوستوں اور بزرگوں میں ہندو اور مسلمان سبھی شریک تھے ۔ اقبال نہایت خندہ پیشانی سے سب کو ملے اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپ کے مزاج میں ولایت پلٹ والوں کی سی کوئی بات نہ تھی ۔ جو سادگی آپ کی طبیعت میں پہلے تھی وہی ولایت سے واپس آنے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی پائی جاتی تھی ۔

ولایت جانے سے قبل اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے اور انگریزی کے پروفیسر تھے اور رخصت لے کر مزید تعلیم حاصل کرنے گئے تھے ۔ واپس آنے پر وہ پھر گورنمنٹ کالج میں پڑھانے لگے لیکن اب انھیں تدریس کے ساتھ وکالت کرنے کی بھی اجازت تھی اور حکومتِ پنجاب کی درخواست پر عدالتِ عالیہ کی طرف سے تمام ماتحت عدالتوں کو حکم تھا کہ جس مقدمے میں اقبال پیش ہوں ، اس کی سماعت لنچ سے پہلے نہ کی جائے ۔ اسی سے اقبال کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ لیکن دو ڈھائی سال کے بعد ہی اُنھوں نے ملازمت سے استعفا دے کر مستقل طور پر بیرسٹری کی طرف توجہ دینی شروع کردی ۔ دوستوں نے وجہ پوچھی تو جواب دیا کہ میں ملازم رہ کر آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا ۔ بیرسٹری کے ذریعے بھی انھیں دولت کمانے کا شوق نہیں تھا ۔ صرف اُتنے ہی مقدمات لیتے تھے جن کی آمدنی سے اُن کا خرچ پورا ہو سکے ۔ جب یہ خرچ پورا ہو جاتا تو مزید مقدمے لینا بند کر دیتے تھے ۔ اس قاعدے میں اُنھوں نے مرتے دم تک فرق نہیں آنے دیا ۔



علامہ اقبال، پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری پانے کے بعد (۱۹۳۳ء)

اعزاز :

۱۹۲۰ء میں جب اقبال کی فارسی مثنوی "اسرارِ خودی" کا انگریزی ترجمہ کیمبرج کے پروفیسر نکلسن نے کیا اور ساتھ ہی چند مضامین آپ کے درس عمل پر یورپ کے پرچوں میں شائع ہوئے ، تو

مغربی ممالک پر آپ کی علمی قابلیت کی دھاک بیٹھ گئی ۔ حکومت برطانیہ نے ۱۹۲۲ء میں آپ کو "نائٹ" (سر) کا خطاب عطا کرکے اپنی معارف نوازی کا ثبوت دیا اور ہندوستان کی بعض یونیورسٹیوں نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگریاں دے کر اپنا وقار بڑھایا ۔

عملی سیاست :

یوں تو علامہ اقبال ذہنی طور پر حرّیت پسند تھے اور ان کی پوری زندگی سیاسی ، معاشرتی اور فکری اصلاح کی سعی میں گزری اور وہ اپنے اشعار کے ذریعے اپنا زندگی افروز پیغام دنیا کو سناتے اور عمل کے لیے ابھارتے رہے ، لیکن عملی طور پر وہ سیاسی آدمی نہیں تھے۔ یہ کہنے کے باوجود کہ :

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں
کہ فیضِ عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

اُن کی سیاسی بصیرت کئی سیاست دانوں پر بھاری تھی ۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے خیال میں تو "ایک عملی سیاست دان کے لحاظ سے بھی وہ غیر معمولی حیثیت کے مالک تھے "۔ دین اسلام کے نصب العین اور اس کے شان دار مستقبل پر کامل یقین رکھنے کی وجہ سے وہ اُن معدودے چند افراد میں شامل تھے جنھوں نے سب سے پہلے اس امکان پر غور کیا کہ برعظیم ہند کے شمال مغربی اور شمال مشرق علاقوں کو ، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ، باقی ہندوستان سے الگ کرکے ایک اسلامی ریاست بنایا جا سکتا ہے ۔ پھر یہ جاننے کے باوصف کہ :

اقبال بڑا اپدیشک ہے ، مَن باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا ، کردار کا غازی بن نہ سکا



علامہ اقبال اپنے ایک دوست نواب ذوالفقار علی خان کے ساتھ

ان کے بعض مخلص دوستوں اور عقیدت مندوں نے بڑے اصرار کے ساتھ ایک دفعہ تو انہیں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا رکن بن کر ملک و ملّت کی خدمت کرنے پر راضی کر ہی لیا - ۱۹۲۶ء کے انتخابات میں وہ امیدوار کھڑے ہوئے۔ دو جلیل القدر امیدوار تو ان کے حق میں دستبردار ہوگئے مگر لاہور کی ارائیں برادری کے ایک سرکردہ بزرگ ملک محمدالدین سے ان کا زبردست مقابلہ ہوا ۔ اقبال کو بھی بادلِ ناخواستہ تھوڑی بہت بھاگ دوڑ کرنی پڑی - ۲۳ نومبر ۱۹۲۶ء کو اس انتخابی مہم کا نتیجہ برامد ہوا اور اقبال ہزاروں ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب قرار دیے گئے - مسلمانوں کے صحیح نمائندے کی حیثیت سے حضرت علامہ نے پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں جاکر حتی المقدور مفید کام کیا ۔

آپ نے ایک قرارداد تو یہ پیش کی کہ بانیانِ مذاہب پر توہین آمیز ، شرانگیز اور کمینہ حملوں کا سدِّ باب کرنے کے لیے ایک قانون نافذ کیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء سے یہ قانون نافذ چلا آتا ہے۔

تلوار کو قانونِ اسلحۂ ہند سے مستثنیٰ کرانے کے لیے آپ نے دوسری قرارداد پیش کی جو منظور ہوئی ۔ چنانچہ "آزادیٔ شمشیر" کے اعلان پر آپ نے مندرجہ ذیل نظم کہی جو "ضربِ کلیم" میں شامل ہے :

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگردار ؟
اس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار
ہے فکر مجھے مصرعِ ثانی کی زیادہ
اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار
قبضے میں یہ تلوار بھی آجائے تو مومن
یا خالدِ جاں باز ہے ، یا حیدرِ کرّار
(ضربِ کلیم ، ص ۲۷)

شراب کی لعنت دور کرنے کے لیے قرارداد پیش کرنے کے علاوہ زمین کا لگان معاف یا کم کرانے اور انکم ٹیکس اور مالیہ اراضی کا فرق مٹانے، نیز زمین کو سرکاری ملکیت سے مستثنیٰ قرار دینے پر حضرت اقبال کی تقریریں بڑی زوردار، مدلّل اور طویل تھیں۔ مگر آپ نے محسوس کیا کہ اس ذریعے سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا، اس لیے آئندہ ہمیشہ کے لیے آپ نے اس طرف کا خیال چھوڑ دیا۔

مدراس لکچر:

۱۹۲۸ء میں اسلام پر چند لکچر دینے کے لیے اقبال مدراس میں مدعو کیے گئے۔ دسمبر ۱۹۲۸ء کے آخری ایام میں آپ مدراس پہنچے، لکچر بھی دیے اور سلطان ٹیپو کے مزار کی زیارت بھی کی



علامہ اقبال، سرنگا پٹم میں ٹیپو سلطان کے مقبرے پر (۱۹۲۹ء)

جو آپ کے "مردِ مومن" کا ایک مثالی نمونہ تھا ۔ وہاں سے حیدرآباد جا کر آپ نے چند خطبات ارشاد فرمائے ۔ ہر جگہ آپ کا شاندار استقبال ہوا اور آپ کی خدمت میں سپاس نامے پیش کیے گئے ۔ یہ تمام خطبات ''Reconstruction of Religious Thought in Islam'' کے نام سے انگریزی میں چھپ چکے ہیں اور ان کا اُردو ترجمہ بھی "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کے نام سے ہو چکا ہے ۔

دو قومی نظریہ :

۱۹۳۰ء میں آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت فرمائی ۔ اس کے بعد مسلم کانفرنس کے صدر منتخب کیے گئے اور آپ نے قوم کی صحیح رہنمائی کی ۔ اسی زمانے میں آپ نے دو قومی نظریہ پیش کیا جو آگے چل کر پاکستان کے قیام کا باعث بنا ۔

گول میز کانفرنس میں شرکت :

۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے انگلستان تشریف لے گئے ۔ اس کے بعد آپ نے روما اور مصر کا سفر



علامہ اقبال، آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد میں اپنا تاریخی خطبہ صدارت ارشاد فرمانے تشریف لا رہے ہیں (۱۹۳۰ء)

کیا اور فلسطین کی مؤتمرِ عالمِ اسلامی میں شرکت کی ۔ روم اور قاہرہ میں آپ نے مختلف ادبی اور سیاسی انجمنوں کے زیرِ اہتمام لکچر دیے جو بے حد پسند کیے گئے ۔

۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کی دعوت پر غازی رؤف بے ہندوستان تشریف لائے اور انھوں نے جامعۂ ملّیہ اسلامیہ دہلی میں چھ لکچر دیے جن کی صدارت حضرتِ علامہ نے فرمائی ۔

اسی سال آپ نے تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے پھر انگلستان کا سفر اختیار کیا اور واپسی پر قدیم اسلامی آثار کی سیر کی اور وہ بے مثال نظم کہی جو "مسجدِ قرطبہ" کے نام سے



علامہ اقبال ——— مسجد قرطبہ میں

طبع ہوئی اور ان کی چند غیر فانی نظموں میں سے ایک ہے۔

عزلت گزینی :

اقبال جب تک کام کرنے کے قابل رہے ، بیرسٹری کی آمدنی سے اپنی ضروریات پوری کرتے رہے ، لیکن جب ناسازیٔ طبع کے باعث آپ عزلت گزینی اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے تو سر راس مسعود کی تحریک سے ریاست بھوپال نے آپ کے کمسن بچوں کی کفالت کے لیے وظیفہ مقرر کردیا جو آپ کی رحلت کے بعد بھی بچوں کوملتا رہا ۔

بیماری اور وصال :

آخری چند برسوں میں آپ بیمار رہنے لگے تھے ۔ بصارت اس درجہ کمزور ہوگئی کہ آنے جانے والے دوستوں کو بھی مشکل سے پہچان سکتے تھے ۔ سنگ گردہ کی تکلیف بھی اکثر رہتی تھی - ۱۹۳۴ء میں آپ عید کی نمازَ پڑھ کر آئے تو دودھ سویّاں کھالیں ، جس سے



جاوید منزل



علامہ اقبال، افغانستان میں سر راس مسعود اور مولانا سید سلیمان ندوی
کے ساتھ (۱۹۳۳ء)

آواز بیٹھ گئی ۔ دیسی اور انگریزی ہر قسم کی ادویات استعمال کیں مگر کسی علاج سے فائدہ نہ ہوا۔

۱۹۳۵ء میں آپ کی رفیقۂ حیات آپ سے جدا ہوگئیں تو اس سانحے نے صحت اور بھی خراب کر دی ۔ چنانچہ ۲۰ اپریل ۱۹۳۸ء کو بیماری کا اثر قلب پر مہلک حد تک پہنچ چکا تھا ۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل حسبِ ذیل قطعہ پڑھ کر وقت آجانے کا اعلان کردیا :

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کے سوا پانچ بجے آپ نے تبسّم برلب اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کی ۔ اُس وقت آپ اپنے اس شعر کی مجسّم تصویر تھے :

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسّم برلبِ اوست

مزارِ اقبال :

شام کے قریب جنازہ اُٹھایا گیا اور لاہور کی شاہی مسجد کے باہر سیڑھیوں کے قریب ایک گوشے میں آپ کو دفن کیا گیا ۔ مزار کی تعمیر ہر طرح آپ کی شان کے شایاں اور اردگرد کے مغل آثار کے مطابق کی گئی ۔ لوحِ مزار کا قیمتی پتھر افغانستان کے بادشاہ کا خاص عطیہ ہے ۔ اب یہ لحد "زیارت گہ اہلِ عزم و ہمّت" ہے اور اس کی مرمریں چھت کی زینت جو اشعار ہیں وہ حضرت علامہ کی ان تین حیثیتوں ــــ شاعر ، مفکّر ، معلّم ــــ کا واضح اعلان کر رہے ہیں ۔ ان سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ خود اقبال کی نگاہ میں اقبال کیا تھا ؟ کل چھ شعر ہیں ۔ دو کا تعلق اقبال بحیثیت شاعر کے ہے ، دو کا بحیثیت مفکّر کے اور دو کا بحیثیت معلّم کے ۔ اقبال فرماتے ہیں کہ شاعر کی حیثیت سے مجھ سے یہ کام لیا گیا :



علامہ اقبال کی آخری آرام گاہ

دم مرا صفت بادِ فرودیں کردند
گیاہ را ز سرشکم چو یاسمیں کردند
نمودِ لالۂ صحرا نشیں ز خونابم
چنانکہ بادۂ لعلے بساتگیں کردند

یعنی : میرے نفس (میری سخن سرائی) سے کارکنانِ قضا و قدر نے بادِ بہاری کا کام لیا ۔ میری قوم اور میری ملت پر خزاں چھائی ہوئی تھی ۔ میرے شعر کی تاثیر نے اسے موسم بہار میں بدل دیا ۔ مردنی جاتی رہی ، حیات تازہ لوٹ آئی ۔ میری اشک فشانی سے یہ سوکھا سڑا گھاس ازسر نو تروتازہ ہوگیا ، بلکہ وہ گلشن میں باعتبارِ رنگ و بو چنبیلی کی مانند کھل اٹھا ۔ (یہاں "گیاہ" سے مراد محکوم و مغلوب قوم ہے) ۔

میرا گریہ خوں نابہ بن گیا اور اس نے لالۂ صحرائی (یعنی گلشن سے دور کس مپرسی میں پڑے ہوئے مسلم نوجوان) کی اس انداز میں آبیاری کی کہ حسن اخوت کے ساتھ اس کی مردہ رگوں میں

تازہ خون اس طرح دوڑنے اور جوش مارنے لگا کہ دیکھنے والا سمجھا یہ مسلم کا چہرہ نہیں ، ایک حسین پیالے میں شراب ارغوانی بھر دی گئی ہے ۔ گویا اس کا چہرہ سرخی سے دمک رہا ہے اور اس کا تن بدن عزم جہاد کے جوش سے لبریز ہے ۔

مفکّر کی حیثیت سے :

بلند بال چنانم کہ بر سپہر بریں
ہزار بار مرا نوریاں کمیں کردند
فروغِ آدمِ خاکی ز تازہ کاری ہاست
مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند

یعنی : توفیقِ ایزدی نے میرے فکر و ادراک کی پرواز کو ایسی رفعت بخشی ہے کہ میں آسمانوں سے پرے عروجِ لاہوتی کی بلندیوں پر جا پہنچتا ہوں ، یہاں تک کہ خود فرشتوں کو ہزار بار یہ ٹوہ لگانی پڑتی ہے کہ یہ جاتا کہاں ہے ؟ اس کی پرواز کی انتہا کیا ہے ؟ وہ کون سے مقامات ہیں جہاں ہمیں آج تک جانا نصیب نہیں ہوا ؟

آدمِ خاکی کا اس مقامِ محمود تک فروغ پانا ، جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہوں ، اس کے فکر کی جدّت ، بدیعیت اور تازہ کاری کی بدولت ہے ۔ سورج ، چاند ، ستارے بظاہر بہت بلند اور روشن ہیں مگر یہ سب مجبور مخلوق ہے ۔ جس ڈگر پر ابتدائے آفرینش سے چلے تھے ، آج تک اسی پر چلے جا رہے ہیں اور قیامت تک اس سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتے ۔ فروغ و ارتقا کی صلاحیت صرف آدمِ خاکی کو حاصل ہے ۔ روشنی اور نورانیت بھی اسی کو ودیعت کی گئی ہے ، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے صحیح آداب اور طریقے اختیار کرے ۔ ساکت و جامد ہو کر نہ بیٹھ جائے ۔ فروغ ، محض تازہ کاری اور جدّت سے اظہار پاتا ہے ۔

معلّم کی حیثیت سے :

چراغِ خویش برافروختم کہ دستِ کلیم
دریں زمانہ نہاں زیرِ آستیں کردند

درآ بسجدہ و یاری ز خسرواں مطلب
کہ روزِ فقر نیاگانِ ما چنیں کردند

وہ رسالت جو فرعونوں کی فرعونیت اور ان کے سحر کو یدِ بیضا سے مغلوب اور معجزات سے سرنگوں کیا کرتی تھی ، بعثتِ محمدیہ کے ساتھ ختم ہوچکی ۔ اب صرف قیامِ ذکر (قرآن حکیم) کی شکل میں زندہ اور موجود ہے ۔ فرعونیت جب بھی سر اٹھائے گی اور جس روپ میں بھی ابھرے گی ، قرآن حکیم کا زندہ معجزہ اسے زیر کر لے گا ۔ میں نے تو مغلوبیت اور ظلمت کے دور میں اس امّت کے سامنے محض ایک چراغ سا روشن کیا ہے ، وہ بھی محض اس لیے کہ نبّوت کا یدِ بیضا "زیرِ آستیں نہاں" کردیا گیا ہے ۔ رسالتِ محمدیہ کے آفتاب عالمتاب کے دنیا پر چمک جانے کے بعد میرے جیسے متّبع امتی کی کیا مجال ہے کہ پیغامِ رسالت سے علیحدہ کسی پیغام یا دعوت کی جرأت کروں ۔

میرا مشورہ یہی ہے کہ خدائے وحدہ لاشریک کے سامنے ایک بار پھر سجدہ ریز ہو جاؤ ، اس کی حکمرانی کا ڈنکا بجاؤ ، اس کے کامل دین کا پورا پورا اتّباع کرو اور دنیا کے سرکش حکم رانوں کی دست نگری چھوڑ دو ۔ "روز فقر" یعنی خلافتِ راشدہ کے عہد میں ہمارے اسلاف نے یہی صراطِ مستقیم اختیار کی تھی اور اسی نسخے پر عمل کرکے اس وقت کے جابروں پر غالب آئے تھے اور اللہ کی مخلوق پر جبری تسلّط و حکومت کرنے والوں پر ثابت کر دیا تھا کہ : "الملک للہ"

شخصیت و کردار :

اقبال نے ساری عمر سادہ زندگی بسر کی۔ وہ خودداری ، استغنا اور فقرِ غیور کا عملی نمونہ تھے۔ انھوں نے کبھی کسی سے سوال نہ کیا اور کبھی کسی کا احسان نہ لیا ۔ ان کی مجلس کے دروازے کسی پر بند نہ تھے۔ ہر ادنیٰ و اعلیٰ ، امیر و غریب ، شناسا و ناشناسا بلا روک ٹوک آ جا سکتا تھا ۔ وہ مسلمان نوجوانوں سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے ۔ ان کا بس چلتا تو اپنی دلی تڑپ ان میں منتقل کر دیتے۔ اسلام

کی حقانیت کا یقین اور ملّتِ اسلامیہ کا درد ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا ۔ ان میں افکار کی جو ثروت پائی جاتی ہے ، اس کی مثال اسلامی شعر و ادب کی تاریخ میں کم ہی ملے گی ۔

اولاد :

علامہ نے تین شادیاں کیں ۔ پہلی بیوی سے ایک صاحبزادہ ، مسٹر آفتاب اقبال بیرسٹر ، موجود ہے ۔ ایک لڑکی بھی ہوئی تھی جو بہت ذہین تھی مگر دس بارہ سال کی عمر میں وہ اللہ کو پیاری ہو گئی ۔ دوسری بیوی سے ایک بچی پیدا ہوئی جو صغر سنی میں فوت ہو گئی اور بیوی بھی زچگی کے عالم میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی ۔ تیسری بیوی سے دو بچے جاوید اقبال اور منیرہ بانو موجود ہیں ۔ حضرت علامہ نے اپنی رحلت سے چند سال قبل ایک وصیّت کے ذریعے چار حضرات کو اپنے چھوٹے بچوں کی کفالت ، دیکھ بھال اور اپنی تخلیقات کا نگران مقرر کیا تھا ۔ ان چار حضرات میں سے ایک تو بچوں کے حقیقی ماموں خواجہ عبدالغنی تھے جو علامہ کی حیات ہی میں انتقال کر گئے ۔ باقی تین صاحبان یہ تھے :

چودھری محمد حسین ، سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ ، لاہور ۔

شیخ اعجاز احمد ، سب جج ، برادر زادۂ اقبال ۔

حکیم منشی طاہرالدین ، موجد "دلروز"۔

چودھری محمد حسین نے اس وصیّت کے ایک ایک حرف پر عمل کر کے وفا کی دنیا میں ایک مثال قائم کی ۔ جاوید اقبال اب ڈاکٹر جاوید اقبال ہو کر لاہور ہائی کورٹ کے جج ہیں ۔ منیرہ بانو کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے گھر میں آباد و شاد ہیں ۔

تصنیفات :

علامہ اقبال نے اُردو ، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں میں اپنی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے :

اُردو :

علم الاقتصاد ۔ بانگِ درا ۔ بالِ جبریل ۔ ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز

کی چند نظمیں

فارسی :

اسرارِ خودی ۔ رموزِ بیخودی ۔ پیامِ مشرق ۔ زبورِ عجم مع گلشنِ رازِ جدید و بندگی نامہ ۔ جاوید نامہ ۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق مع مثنوی مسافر اور ارمغانِ حجاز (اس میں فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کا کلام جمع ہے) ۔

انگریزی :

ایران میں فلسفۂ مابعد الطبیعات کا ارتقا ۔ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ ۔ ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر ۔ خلافت اسلامیہ ۔

(۱) علم الاقتصاد ــــ یہ معاشیات پر پہلی مستند کتاب ہے جو اُردو زبان میں لکھی گئی ۔ اس کا دوسرا ایڈیشن چند سال ہوئے شائع ہوا تھا ۔ اب بھی مل جاتی ہے ۔

(۲) ایران میں فلسفۂ مابعدالطبیعیات کا ارتقا ــــ یہ علامہ کا وہ مقالہ ہے جس پر آپ کو پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری ملی تھی ۔ اصل انگریزی کتاب ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی تھی ۔ اس کا ترجمہ میر حسن الدین بی ۔ اے ، ایل ۔ ایل ۔ بی (عثمانیہ) نے اُردو میں "فلسفۂ عجم" کے نام سے کیا تھا ۔ علامہ کے اپنے بیان کے مطابق :

"اس تحقیق کا مقصد ، جیسا کہ ظاہر ہو جائے گا ، ایرانی مابعدالطبیعیات کی آیندہ تاریخ کے لیے ایک بنیاد تیار کرنا ہے ۔ ایسے تبصرے میں ، جس کا نقطۂ نظر خالص تاریخی ہے ، ایسے تفکّر کی امید رکھنی چاہیے جس میں جلت اور اُپج ہو ۔ تاہم حسبِ ذیل دو امور کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانے کی جسارت کرتا ہوں :

(الف) میں نے ایرانی تفکّر کے منطقی تسلسل کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے اور اس کو میں نے فلسفۂ جدید کی زبان میں پیش کیا ہے ۔

(ب) تصّوف کے موضوع پر میں نے زیادہ سائنٹیفک طریقے

سے بحث کی ہے اور اُن ذہنی حالات و شرائط کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے جو اس قسم کے واقعے کو معرضِ ظہور میں لے آتے ہیں ۔ لہٰذا اس خیال کے برخلاف ، جو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے ، میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تصوّف اُن مختلف عقلی و اخلاقی قوتوں کے باہمی عمل و اثر کا نتیجہ ہے جو ایک خوابیدہ روح کو بیدار کرکے زندگی کے اعلیٰ ترین نصب العین کی طرف رہنمائی کرتی ہیں ۔"

(۳) بانگِ درا ـــــ یہ اقبال کے ابتدائی تین ادوار کے اُردو کلام کا منتخب مجموعہ ہے جو ۱۹۲۴ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا ۔ اقبال نے اپنی بعض ابتدائی نظمیں ، جو "مخزن" اور دوسرے پرچوں میں شائع ہوئی تھیں یا جو انجمنِ کشمیری مسلمانان اور انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے جلسوں میں پڑھی گئی تھیں ، اس مجموعے میں شامل نہیں کیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کے معیار پر پوری نہیں اُتریں ۔ اس کتاب کے ۱۹۲۴ء سے جون ۱۹۷۵ء تک بتّیس ایڈیشن چھپ چکے ہیں ۔

(۴) بالِ جبریل ـــــ پہلی بار ۱۹۳۵ء میں منظرِ عام پر آئی ۔ اس میں اوّل غزلیات ہیں ، پھر رباعیات و قطعات اور آخر میں مختلف عنوانات کے تحت نظمیں ہیں ۔ یہ جنوری ۱۹۷۵ء تک بیس مرتبہ چھپ چکی ہے ۔ یہ اقبال کی اُردو شاعری کی معراج ہے کہ اس میں علامہ نے غزل کے دلفریب پیرایے میں وہ تمام حقائق و معارف اور تعلیمات بیان فرمائی ہیں جو ملّت میں خلوص و ایقان پیدا کرنے ، طلسمِ مغرب سے اجتناب کرنے اور مردِ مومن بننے کے لیے کارآمد ہیں ۔

(۵) ضربِ کلیم ـــــ یہ ۱۹۳۶ء میں "زمانۂ حاضر کے نام ایک اعلانِ جنگ" کی صورت میں پیش کی گئی ۔ تمہید کے بعد تمام غزلیں اور نظمیں چھ عنوانات میں منقسم ہیں : (۱) اسلام اور مسلمان ۔ (۲) تعلیم و تربیت ۔ (۳) عورت ۔ (۴) ادبیات ، فنونِ لطیفہ ۔ (۵) سیاسیات مشرق

و مغرب۔ (۶) محراب گل افغان کے افکار۔ ہر مسئلے میں علامہ کے جواہر افکار قول فیصل کا حکم رکھتے ہیں اور ان میں جو درس و پیغام پوشیدہ ہے وہ تمام اقوام و ملل کی نجات کا ذریعہ ہے۔ جولائی ۱۹۳۶ء سے جنوری ۱۹۷۶ء تک اس کے اٹھارہ ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

(٦) "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" اور "خلافت اسلامیہ" علامہ اقبال کے دو لکچر تھے جو انگریزی زبان میں دیے گئے تھے۔ اوّل الذکر کا اُردو ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے اور ثانی الذکر کا چودھری محمد حسین نے کیا ہے۔

(۷) اسرار خودی — فارسی زبان میں یہ اقبال کی پہلی تصنیف ہے جو ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت سے لے کر اب تک اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس میں علامہ نے مختلف طریقوں سے ثابت کیا ہے کہ تمام کائنات "خودی" کے تابع فرمان ہے۔ جب خودی کے ساتھ عشق کا امتزاج ہوتا ہے تو خودی تمام عالم اور ماورائے عالم پر چھا جاتی ہے۔ خود شکنی علامہ اقبال کے نزدیک مذموم ہے لیکن خودگری اور خود شناسی ان کا مقصد حیات۔ اقبال خودی کی راہ بتا کر ان مدارج سے آگاہ کرتے ہیں جن سے گذر کر خودی تکمیل کی منزل پر پہنچتی ہے اور عارف خودی کو خلیفۃ اللہ فی الارض کا اہل بناتی ہے۔ اس مثنوی کا ترجمہ دنیا کی متعدد زبانوں میں ہوچکا ہے۔

(۸) رموز بیخودی (فارسی) — یہ دراصل "اسرار خودی" ہی کا دوسرا حصہ ہے جو ۱۹۱۸ء میں علیحدہ شائع ہوا۔ پھر "اسرار و رموز" میں یک جا کر دیا گیا۔ اس میں اقبال نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اسلامی آئین، حیات ملی کے لیے بہترین ضابطہ ہے۔ افراد پر لازم ہے کہ وہ ایک خاص حد تک انا کی انفرادی حیثیت کو قائم و محفوظ رکھیں۔ اس کے بعد ملت کی فلاح و بہبود پر اپنی انفرادیت کو قربان کردیں۔ اس کتاب کو یوں تو علامہ نے ملت اسلامیہ کے حضور میں پیش کیا ہے لیکن "اسرار و رموز" دونوں مثنویوں کا مخاطب تمام عالم انسانیت ہے۔ ان کے ذریعے اقبال نے عصر حاضر کے ان غلط نظریوں

کی قلعی کھولی ہے جو افراد اور ملّت کی بابت قائم کیے گئے تھے اور ان کی حفاظت ، بقا ، تسلسل اور ترقی کے لیے صحیح راستہ بتایا ہے ۔

ان دونوں مثنویوں کا تعلق ملّت کے ماضی سے تھا ۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ملّت کے مستقبل کے بارے میں بھی کچھ کہا جاتا ۔ اقبال کے ذہن میں اس کا خاکہ بھی موجود تھا ۔ چنانچہ وہ مولانا گرامی کو یکم جولائی ۱۹۱۷ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"مثنوی کا دوسرا حصّہ (یعنی رموزِ بیخودی) قریب الاختتام ہے مگر اب تیسرا حصّہ ذہن میں آرہا ہے اور مضامین دریا کی طرح امڈے آرہے ہیں ، اور حیران ہو رہا ہوں کہ کس کس کو نوٹ کروں ۔ اس حصّے کا مضمون ہوگا "حیات مستقبلۂ اسلامیہ" یعنی قرآن شریف سے مسلمانوں کی آیندہ تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے اور جماعت اسلامیہ ، جس کی تاسیس دعوتِ ابراہیمی سے شروع ہوئی ، کیا کیا واقعات و حوادث آیندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے اور بالآخر ان سب واقعات کا مقصود و غایت کیا ہے ؟ میری سمجھ اور علم میں یہ تمام باتیں قرآن شریف میں موجود ہیں اور استدلال ایسا صاف اور واضح ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تاویل سے کام لیا گیا ہے ۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اس نے قرآن شریف کا یہ مخفی علم مجھ کو عطا کیا ہے ۔ میں نے پندرہ سال تک قرآن پڑھا اور بعض آیات اور سورتوں پر مہینوں بلکہ برسوں غور کیا ہے اور اتنے طویل عرصے کے بعد مندرجہ بالا نتیجے پر پہنچا ہوں ، مگر مضمون بڑا نازک ہے اور اس کا لکھنا آسان نہیں ۔ بہرحال میں نے یہ قصد کرلیا ہے کہ اس کو ایک دفعہ لکھ ڈالوں گا اور اس کی اشاعت میری زندگی کے بعد ہو جائے گی ، یا جب اس کا وقت آئے گا ، اشاعت ہو جائے گی ۔"

مگر یہ ارادہ کسی وجہ سے عملی صورت اختیار نہ کر سکا ۔

(۹) پیامِ مشرق (فارسی) — یہ جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے (GOETHE) کے "مغربی دیوان" کا جواب ہے ۔ یہ کتاب ۱۹۲۳ء میں

شائع ہوئی ۔ اُس وقت سے ۱۹۷۵ء تک اس کے چودہ ایڈیشن نکل چکے ہیں ۔ دیباچے میں اقبال نے اس کا مدعا بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے :

"پیامِ مشرق کے متعلق ، جو "مغربی دیوان" سے سو سال بعد لکھا گیا ہے ، مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ۔ ناظرین خود اندازہ کرلیں گے کہ اس کا مدّعا زیادہ تر اُن اخلاق ، مذہبی اور ملّی حقائق کو پیش کرنا ہے جن کا افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے تعلق ہے ۰۰۰ مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے ۔ مگر اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں اُس وقت تک کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کرسکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو ۔ اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکّل نہ ہو ۔ فطرت کا یہ اٹل قانون ، جس کو قرآن نے "ان اللہ لایغیّر مابقوم حتیٰ یغیّروا ما بانفسہم" کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے ، زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے ۔ اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے ۔"

گوئٹے نے مغرب میں روحانیت کے فقدان کا رونا رویا ہے اور مشرق سے اس پیغام کی توقع کی ہے ۔ اقبال نے سو سال بعد مغربی ممالک کو اخلاق ، مذہب اور معاشرت کا سبق یاد دلایا ہے اور احساس ، جوش ، حرکت ، عمل اور عشق کے جذبات پیدا کرنے پر زور دے کر یورپ کو بتایا ہے کہ بغیر روحانیت کا درس حاصل کیے زندگی اعلیٰ مدارج پر فائز نہیں ہوسکتی ۔

(۱۰) زبورِ عجم (فارسی) ـــــ اس میں مثنوی "گلشنِ رازِ جدید" اور "بندگی نامہ" بھی شامل ہے ۔ یہ جون ۱۹۲۷ء سے اگست ۱۹۷۸ء تک دس بار چھپ چکی ہے ۔ مثنوی "گلشنِ رازِ جدید" میں حضرت

علامہ نے سیّد محمود شبستری کی مشہور مثنوی "گلشنِ راز" کی تقلید میں نو سوال قائم کرکے ان کا جواب دیا ہے اور مسئلۂ وحدت الوجود کو جدید روشنی میں حل کرکے عملی دنیا پر اس کا اثر اور تعلق ظاہر کیا ہے -

"بندگی نامہ" دراصل غلامی اور محکومیت کے خلاف ایک جہاد ہے - اس میں پہلے بندگی سے بحث کی ہے - پھر غلاموں کے فنون لطیفہ ــــ موسیقی اور مصوری ــــ پر تبصرہ کیا ہے اور آخر میں مردانِ حر کے فنِ تعمیر سے روشناس کرایا ہے -

غزلیات اور قطعات کے ایک حصّے میں حضرت علامہ نے خدا سے خطاب کیا ہے اور دوسرے حصّے میں تمام عالم بالخصوص مشرق کو مخاطب کرکے عام بیداری کا پیغام دیا ہے - نیز یادِ عہد ماضی ، حرکت ، بیداری ، ذوقِ عمل ، محبّت اور زندگی پیدا کرنے کا درس دیا ہے تاکہ عہدِ رفتہ کی شان و شوکت اور تجمّل و حشمت دوبارہ حاصل کی جاسکے اور مشرق ایک بار پھر مادی اور روحانی دنیا پر اپنی برتری اور تفّوق کا پرچم لہرا سکے - "زبورِ عجم" میں اقبال نے غزل کو اوجِ کمال پر پہنچا کر ثابت کردیا ہے کہ بلند سے بلند خیالات اور مؤثر تلقینات کے لیے بھی غزل سے زیادہ زوردار اور زندہ صنفِ سخن موجود نہیں ہے - یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنے خوانندگان سے سفارش کی ہے کہ : ع

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم

(۱۱) جاوید نامہ (فارسی) ــــ یہ اطالوی شاعر دانتے (Dante) کی طربیۂ خداوندی (Divine Comedy) کا جواب ہے - ۱۹۳۲ء سے ستمبر ۱۹۷۴ء تک اس کے چھ ایڈیشن چھپ چکے ہیں - اس میں زندہ رود اقبال نے پیرِ رومی کی رہنمائی میں افلاک کی سیر کی ہے اور قربِ حضور اور تجلّیات سے ہم کنار ہونے کا شرف حاصل کیا ہے - فلکِ قمر ، وادیٔ طواسین ، فلکِ عطارد ، فلکِ زہرہ ، فلکِ مریخ ، فلکِ مشتری ، فلکِ زحل اور ماورائے افلاک پر جن خاص خاص شخصیات

سے ملاقات ہوتی ہے ، ان کی زبانی اقبال نے کئی پیچیدہ مسائل حل کیے ہیں اور نہایت مفید تعلیم دی ہے ۔ آخر میں اپنے بیٹے جاوید کو مخاطب کرکے جملہ نوجوانوں کو پیغام دیا ہے اور "نژادِ نو" کے رجحانات و مقتضیات کے مطابق ان کی رہنمائی کی ہے ۔

(۱۲) پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق مع مثنوی مسافر ـــ یہ ۱۹۳۶ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی ۔ ۱۹۷۲ء تک اس کے سات ایڈیشن نکل چکے ہیں ۔ اس میں اقبال ، پیرِ رومی کی زبان سے یہ مژدہ سناتے ہیں :

خاور از خوابِ گران بیدار شد

پھر انھی کی زبانی اقوامِ مشرق کو حکمت کلیمی اور حکمت فرعونی کے خصائص بتا کر توحید کا درس دیتے اور نفی و اثبات کو "ساز و برگ امّتاں" ثابت کرتے ہیں ۔ فقر اور مردِ حر کی ایمان افروز تفسیر و تفصیل بیان کرنے کے بعد شریعت و طریقت کے اسرار و رموز سمجھاتے اور "افتراقِ ہندیاں" پر ماتم کرکے اتحاد کا سبق دیتے ہیں ۔ سیاسیات حاضرہ کا تجزیہ کرنے کے بعد اُمّتِ عربیہ کو ان کا شاندار ماضی یاد دلاتے ہیں ۔ پھر تمام اقوامِ مشرق کو سیاسیاتِ فرنگ کا طلسم توڑ کر بیداری کی تلقین کرتے ہیں ۔

مثنوی "مسافر" سیاحتِ افغانستان کی یادگار ہے ۔ اس میں اقوامِ سرحد کو نصیحت کی گئی ہے کہ "رمزِ دینِ مصطفیٰؐ" جانیں اور اپنے وجود میں "تعمیرِ خودی" کریں ۔

(۱۳) ارمغانِ حجاز ـــ یہ کتاب حضرت علامہ نے اپنی آخری بیماری کے دنوں میں مرتب کی تھی مگر اس کی اشاعت ان کے انتقال کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں ہوئی ۔ اس کے ایک حصّے میں فارسی قطعات و رباعیات ـــ حضورِ حق ، حضورِ رسالت ، حضورِ ملّت ، حضورِ عالمِ انسانی اور بہ یارانِ طریق وغیرہ ـــ ہیں ، جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے عالمِ تصوّر میں حجاز کا سفر کر رہا ہے ۔ فکر کی گہرائی اور عشق کی شدّت ان قطعات کی خصوصیّت ہے ۔

کتاب کے دوسرے حصّے میں "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" اور چند دیگر اُردو نظمیں مثلاً بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو، تصویر و مصور، عالمِ برزخ، آوازِ غیب اور مـلّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے ذریعے زمانۂ حال کے سیاسی و معاشری انقلابات اور فکری تحریکات پر فیصلہ کن تنقید کی گئی ہے، جن سے کئی راز ہائے سربستہ کا انکشاف ہوتا اور صحیح رہنمائی ملتی ہے۔ ستمبر ۱۹۷۵ء تک اس کے گیارہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

(۱۴) تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ

(The Reconstruction of Religious Thought in Islam)

یہ علامہ اقبال کے اُن چھ فلسفیانہ خطبات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مدراس اور حیدرآباد میں ارشاد فرمائے۔ یہ مجموعہ پہلی مرتبہ ۱۹۳۰ء میں لاہور سے، دوسری مرتبہ ۱۹۳۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے معمولی تبدیلیوں اور ساتویں لکچر کے اضافے کے ساتھ اور تیسری



سیالکوٹ میں علامہ اقبال کے مطالعے کا کمرہ

مرتبہ پھر لاہور سے شائع ہوا۔ علم اور روحانی تجربات، روحانی تجربات کا فلسفیانہ معیار، ذات واجب کا تصوّر اور حقیقت عادت، انائے انسانی اور جبر و اختیار، تمدّن اسلامی کی روحیت، نظام اسلام میں روحِ حرکت (یعنی اجتہاد) وغیرہ اس کے موضوعات ہیں۔ اس کتاب میں علامہ گویا ایک جدید اسلامی علمِ کلام کے بانی کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ آپ نے ان مسائل پر اسلام اور فلسفۂ جدید کے حوالے سے سیر حاصل بحث کی ہے اور مفکّرینِ عصرِ حاضر کے لیے اسلام پر غور و فکر کے دروازے کھول دیے ہیں۔ سید نذیر نیازی نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کیا ہے جو ۱۹۵۷ء میں ایک بار چھپ کر نایاب ہوچکا ہے۔ ان خطبات کے مطالعے کے بغیر علامہ اقبال کے منظّم فکر سے آگاہی حاصل کرنا ممکن نہیں۔

ان کتابوں کے علاوہ "مکاتیبِ اقبال" کے کئی مجموعے مرتّب ہو چکے ہیں جن میں اقبال بے تکلف ہنستے بولتے اور علم و حکمت کے انمول موتی رولتے نظر آتے ہیں۔

متعدّد انگریزی اور اردو مضامین جو مختلف رسالوں اور اخباروں میں بکھرے پڑے تھے۔ پھر متفرّق لکچر، خطبات، بیانات اور پیغامات بھی ادھر ادھر سے جمع کرکے کئی اداروں نے کتابی صورت میں شائع کیے ہیں۔ ان میں Stray Reflections ، گفتارِ اقبال، مقالاتِ اقبال اور حرف اقبال قابلِ ذکر ہیں۔

نظریہٗ حیات:

اقبال کے نظریۂ حیات کا خلاصہ، جیسا کہ دائرۂ معارف اسلامیہ میں دیا گیا ہے، یہ ہے:

(۱) اقبال اسلام کے سچّے معتقد اور اسلامی تہذیب کے بہت بڑے داعی تھے۔ خدا ان کے نزدیک خلاق ازلی ہے۔ اس کی خلاقی ہر لمحہ بروئے کار آتی رہتی ہے۔ زندگی سراپا خلاق ہے (انسان اگر اپنے مقصد سے آگاہ ہوجائے تو وہ اپنی اس خلاق کی جہت متعیّن کر سکتا ہے)۔

(۲) نوعِ انسان کے ارتقا کا سدرۃ المنتہیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات بابرکات تھی ۔ ختمِ نبوّت کے معنی یہ ہیں کہ اب کسی نبی کی ضرورت نہیں رہی، کیونکہ زندگی کے تمام بنیادی حقائق خدا کی آخری کتاب قرآن حکیم میں محفوظ کر دیے گئے اور لامتناہی ترقی کی راہیں کھول دی گئیں ۔ ملّت اسلامیہ کو اجتہاد کا دروازہ بند نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اصل زندگی اور اس کا مقصد جہادِ پیہم اور اجتہادِ مسلسل ہے ۔ زندگی کے سانچے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کریم نئی تشکیلِ افکار اور تعمیرِ اقدار میں ہمیشہ ہر ارتقا پر حاوی رہے گا ۔

(۳) انسان کو اپنے ظاہر اور باطن دونوں کی تسخیر سے اپنی معرفت اور قدرت میں اضافہ کرنا چاہیے ۔

(۴) اقبال تہذیب و تمدنِ افرنگ پر شدّت کے ساتھ تنقید کرتے ہیں ۔ وہ یورپ کی محدود عقلیت اور مادیّت سے بیزار ہیں ۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی یورپ کی طرح علوم و فنون میں ترقی کریں لیکن مادی تمدن میں روحانی اندازِ تفکّر و تأثر کی آمیزش سے اسے کامل انسانیت کا آئینہ دار بنائیں ۔

(۵) اقبال زندگی کے ہر دائرے میں صرف اسلامی نظام کی پابندی کے داعی ہیں ۔

(۶) اقبال ، اسلام کے ارکان و شعائر کی پابندی تعمیر و تکمیلِ سیرت کے لیے لازم قرار دیتے ہیں ، لیکن باطن کو ظاہر پر بہرحال ترجیح دیتے ہیں ۔

(۷) اسلامی تعلیم میں غیراسلامی تصوّف اور فرار عن الحیات کے جو عناصر داخل ہو گئے تھے ، اقبال مسلمانوں کو ان سے احتراز کی دعوت دیتے ہیں ، لیکن وہ تصوّف کے اس صحیح جوہر کے قائل و معتقد ہیں جو رومی جیسے اکابر

صوفیہ میں پایا جاتا ہے۔

(۸) فلسفیانہ حیثیت سے اقبال تخلیقی ارتقا پسند (Creative evolutionist) ہیں۔ اس لحاظ سے انہیں برگساں کا ہم نوا سمجھنا چاہیے۔ وہ نٹشے (Neitzsche) کے بھی مداح ہیں لیکن کہتے ہیں کہ کبریائی کا صحیح تصوّر قائم نہ کرسکنے کے باعث وہ توازن کھو بیٹھا اور اسے کوئی مرشدِ کامل نہ ملا۔

(۹) اقبال کا خاص مضمون خودی کی معرفت اور تکمیل ہے۔ عرفانِ نفس سے عرفانِ ذاتِ الٰہی کی طرف راستہ کھلنے کا مضمون پرانا تھا۔ اقبالؔ نے اس کی تشریح و توضیح اس انداز سے کی جو اس سے قبل کہیں نظر نہیں آتی۔

(۱۰) خودی کے علاوہ اقبال کا خاص مضمون عشق ہے جو اُن کے نزدیک ملکۂ خلاق ہے۔ منطقی عقل کے مقابلے میں عشق ہی حقیقی معرفت کا سرچشمہ ہے۔ صوفیانہ حکمت اور وجدان کا یہ مضمون بھی پرانا تھا۔ اقبال کے دل و دماغ اور شاعری کے کمال نے اس میں غیر معمولی وسعت، تازگی اور گہرائی پیدا کردی۔

افکار کے لحاظ سے اقبال ملّتِ اسلامیہ کے عظیم ترین رہنماؤں میں شمار ہونے کے حقدار ہیں۔ ان کے افکار و تأثرات مسلمانوں کے شعور اور تحت الشعور میں جا گزیں ہیں۔ انہیں جمود سے نکال کر حرّیت و تحقیق کے راستے پر ڈالنے میں جتنی کامیابی اقبال کو ہوئی، اُن کے معاصرین میں سے کسی مفکّر اور رہنما کو نہ ہوئی۔ ان کا اثر پاک و ہند سے نکل کر افغانستان اور ایران کے علاوہ عربی اور فرنگی دنیا تک پہنچ چکا ہے۔ وہ اُن شخصیتوں میں سے ہیں جو صدیوں کے بعد فضائے انسانیت کو منوّر کرتی ہیں۔"

(دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۳، ص ۱۳-۱۴)

منصب کی ادائیگی :

ایک عظیم شاعر ، مفکّر اور مصلح کی حیثیت سے اقبال نے اپنے منصب کی ذمہ داریوں کو باحسن وجوہ پورا کیا ۔ اپنے مقصدِ حیات اور نصب العین کی تکمیل کے لیے انھوں نے کیا ذرائع اختیار کیے اور اس میں وہ کس طرح کامیاب ہوئے ؟ اس دلچسپ داستان کو محمد عبداللہ قریشی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے :

"اقبال کی طبیعت کی وسعت اور ہمہ گیری کئی رنگوں میں جلوہ گر ہوئی ۔ انھوں نے ایک طرف شعر و سخن میں نئی راہیں نکالیں تو دوسری طرف فلسفے میں نئی رائیں قائم کیں ۔ ان کی فلسفیانہ اور حکیمانہ شاعری نے مردہ قوم میں حیات تازہ پیدا کی ۔

فلسفی محض حقائق کی خشک اور بے جان تعبیر کرتا ہے مگر شاعر اس کی زندگی سے چھلکتی ہوئی تفسیر ۔ فلسفی صورت کائنات کا ذہنی ادراک کرکے اپنے نتائج مجرّد تصورات میں بیان کرتا ہے ، مگر اقبال کہتے ہیں :

"شاعر کی بدنصیبی ہے کہ اس کا کام برا بھلا جو کچھ بھی ہو ، غیر محسوس ہوتا ہے اور ظاہر ہیں آنکھیں مرئیات کی طرف قدرۃً زیادہ متوجہ ہوتی ہیں ۔"

(مکتوب بنام خواجہ حسن نظامی)

ایک وقت تھا کہ اقبال کی بات سمجھنے والا کوئی نہ تھا ۔ وہ اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرتے تھے اور فرماتے تھے :

"لاہور ایک بڑا شہر ہے ، لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں ۔ ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جاسکے :

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل رازداں کے واسطے

لارڈ بیکن لکھتے ہیں ، جتنا بڑا شہر ہو ، اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی ہے ، سو یہی حال میرا لاہور میں ہے ۔"

(مکتوب بنام اکبر الہ آبادی ۶۔اکتوبر ۱۹۱۱ء)
"اسرارِ خودی" ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی - اس میں بھی تنہائی کا ذکر یوں آیا ہے :

من کہ بہر دیگران سوزم چو شمع
بزمِ خود را گریہ آموزم چو شمع
دل بدوش و دیدہ بر فرداستم
درمیانِ انجمن تنہاستم
در جہان یا رب ! ندیمِ من کجاست
نخلِ سینایم کلیمِ من کجاست
شمع را تنہا تپیدن سہل نیست
آہ ! یک پروانۂ من اہل نیست
انتظارِ غمگساری تا کجا
جستجوی رازداری تا کجا
من مثالِ لالۂ صحراستم
درمیانِ محفلی تنہاستم

پھر خدا سے یارِ ہمدم اور محرمِ راز کی تمنا کی ہے :

خواہم از لطفِ تو یاری ہمدمی
از رموزِ فطرتِ من محرمی
ہمدمی دیوانہ ای ، فرزانہ ای
از خیالِ این و آن بیگانہ ای
تا بجان او سپارم ہوی خویش
باز بینم در دل او روی خویش

یہ دعا مقبول ہوئی اور آخر اقبال کو رازداں مل گئے :

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

دراصل شاعر کی بے شمار مشکلات میں سے ایک یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ جب کچھ کہنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اسے زبان اور اسلوب

کے مسئلے سے اُلجھنا پڑتا ہے تاکہ اس کے مطالب کے ابلاغ میں آسانی ہو ۔ وہ سب کچھ اپنی سوچ بچار ، اپنی کاوش ، اپنے خونِ جگر اور زبان کے اُلٹ پھیر سے پیدا کرتا ہے ۔ یوں تو ہر لفظ لغت میں موجود ہوتا ہے اور کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا مگر شاعر ان کے



علامہ اقبال ـــــ ایک مصور کی نظر میں

مخصوص استعمال سے انھیں اپنا بنا لیتا ہے اور اُن پر اپنی مہر لگا دیتا ہے ۔ پھر وہ الفاظ لغت کے نہیں رہتے ، شاعر کے بن جاتے ہیں ۔ تخلیقی عمل میں زبان و بیان کے مسئلے سے اُلجھنے کے بعض نہایت سخت مراحل سامنے آتے ہیں ۔ ان مراحل کو نظر انداز کرکے ہم کسی شاعر کی تخلیقی کاوش کو سمجھ ہی نہیں سکتے ۔ علامہ اقبال نے ایک دفعہ اسی اُلجھن سے جھنجھلا کر کہا تھا :

"شاعر کی جگرکاوی کا اندازہ عام لوگ نہیں لگا سکتے ۔ ان کے سامنے شعر بنا بنایا آتا ہے ۔ وہ اُس روحانی اور لطیف کرب سے آشنا نہیں ہوسکتے جس نے الفاظ کی ترتیب پیدا کی ۔ جہاں اچھا شعر دیکھو ، سمجھ لو کہ کوئی نہ کوئی مسیح مصلوب ہوا ہے ۔ اچھے خیال کا پیدا کرنا اَوروں کے لیے کفّارہ ہوتا ہے ۔"
(مکتوب بنامِ گرامی)

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اقبال نے واقعی مسیحائی کر دکھائی ۔ اُنھوں نے نبضِ کائنات کی تڑپ اور قلبِ حیات کی دھڑکن محسوس کی اور اپنے احساسات کو متحرّک نقش اور نغمے میں ادا کیا ۔ شاعری کی ابتدا غزل سرائی سے کی لیکن غزل کی شہسواری ان کا مطمحِ نظر نہ تھی ۔ وہ وقتی جذبات اور خواب آور محسوسات سے نکل کر بلندیوں میں اُڑنے کے لیے پر تول رہے تھے ، اس لیے ان کی نظریں اُفق میں وسیع تر وادیاں ، ہمالیہ جیسے باجبروت پہاڑ اور فلک بوس چوٹیاں دیکھ رہی تھیں اور ستاروں سے آگے جانے کے لیے ان کا دل مچل رہا تھا ۔

جب اقبال کو اپنے قلم کی طاقت پر بھروسا ہوگیا تو انھوں نے غزل سرائی کے ساتھ ساتھ نظم کے وسیع اصناف کی طرف توجہ مبذول کی ۔ بقول ڈاکٹر شفاعت احمد مرحوم ، اقبال کو یہ تو ابتدا ہی سے احساس تھا کہ ان کی زندگی کا ایک نصب العین ہے ، مشن ہے ، لیکن وہ دراصل ہے کیا ؟ اس کی ابھی کچھ خبر نہ تھی ۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ دریا ، پہاڑ ، سورج ، چاند ، ستارے سب اپنے سینے میں

کوئی راز چھپائے ہوئے ہیں ۔ وہ حقیقت کی جستجو میں ہر شے سے مخاطب ہوتے اور ہر چیز سے استفسار کرتے۔ کبھی وہ شمع سے سوال کرتے کہ پروانہ اسے پیار کیوں کرتا ہے ؟ کبھی گلِ رنگیں کو یہ کہہ کر پھسلاتے کہ اس کی نظر "غیر از نگاہِ چشمِ صورت بیں" نہیں ۔ شاید اسی طرح وہ اپنا راز اُگل دے ۔ کبھی وہ ہمالہ کی زبان سے اُس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا سننے کی خواہش کرتے جس پر "غازۂ رنگ تکلف کا داغ" نہ تھا ۔ "خفتگانِ خاک" کی طرف سے گذرتے تو انھی کی کیفیت دریافت کرنے لگتے ۔ اشاروں ہی اشاروں میں ہر چیز ان سے ہم کلام ہوتی اور انھیں کچھ نہ کچھ بتا دیتی ۔

کہیں سے انھیں "تلاشِ متّصل" کا سبق ملتا ، کہیں ان پر "حسنِ ازل" اور وحدت و کثرت کے راز منکشف ہوتے اور کہیں وہ مآلِ حسن دیکھ کر کانپ اٹھتے ۔ لیکن ان چیزوں میں ابھی انھیں کوئی ربطِ نظر نہیں آتا تھا ۔ ہر شے ایک دوسری سے بے تعلق معلوم ہوتی تھی اور ایک مختلف پیغام سناتی تھی ۔ اس کثرت میں شاعر کو اُس وحدت کی تلاش تھی جو نہ صرف اس کے لیے "سامانِ جمعیّت" ہو بلکہ "شمع جہاں افروز" بھی ہو ۔ اسی تگ و دو ، اسی سرگرانی اور اسی بے قراری میں وہ جل رہے تھے اور کسی پہلو کل نہیں پڑتی تھی ۔ وہ "رحمت تنگیٔ دریا" سے گریزاں تھے اور "وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں"۔ کبھی تو وہ اس زندگی سے ، جو "سراپا سوز و آرزو" ہے ، گھبرا اٹھتے اور پھول کی قسمت پر رشک کرنے لگتے کہ اس کی زندگی "بے گداز آرزو" ہے اور وہ "زیبِ محفل" ہوتے ہوئے بھی "شریک شورشِ محفل" نہیں ۔ بعض نظمیں پڑھنے سے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کی طبیعت میں کچھ بے کلی اور بے چینی سی ہے ۔ اسے کس بات کی ٹوہ ہے جسے وہ ابھی تک پا نہیں سکا ؟ وہ کس چیز کی کھوج میں ہے جس کا کوئی اتا پتا نہیں ملتا ؟ اس کے سامنے کچھ الجھنیں ہیں جنھیں وہ سلجھانا چاہتا ہے مگر اسے کوئی سرا نہیں ملتا ۔ اس کے دل میں بار بار کچھ سوال پیدا ہو رہے ہیں جن کا تشفی بخش

جواب اسے نہیں ملتا ۔ جب دیوانگی کے جوش سے تنگ آجاتا ہے تو "محیطِ آبِ گنگا" سے التجا کرتا ہے کہ اسے اپنی آغوش میں لے کر ڈبو دے ۔

ابھی تک ان کا نغمہ "جبرئیل آشوب" نہیں ، صرف "صدائے درد" تھا ، لیکن وہ اپنے آپ کو یاسیت کے سمندر میں غرق نہیں ہونے دیتے تھے ۔ وہ اپنے پر و بال کی تاب و تواں کا جائزہ لیتے اور پھر اطمینان کا گہرا سانس کھینچتے ۔ اس گھٹاٹوپ تاریکی میں انھیں کبھی کبھی بجلی کی چمک دکھائی دیتی ۔ بہت سے دکھوں اور دردوں کا مداوا تو انھیں حضرت بلال کی پیروی میں نظر آیا ، جو عشق میں تڑپتے تھے اور ایک دم کے لیے بھی قرار نہ لیتے تھے ۔ ایسے موقعوں پر انھیں "کشودِ عقدۂ مشکل" میں لذت ملنے لگتی اور وہ اپنی "سعیِ لاحاصل" ہی میں "لطفِ ضد حاصل" پاتے ۔

اسی زمانے میں اقبال "ترانۂ ہندی" اور "میرا وطن وہی ہے" جیسی قومی نظمیں لکھتے ہیں ۔ وہ اپنے وطن کی "نفاق انگیزی" پر کڑھتے ہیں ۔ مادرِ وطن کے فرزندوں کا افتراق انھیں ایک آنکھ نہ بھاتا ۔ وہ بار بار اہلِ ملک کو جھنجھوڑتے کہ "وطن پر مصیبت آنے والی ہے" اور اس کی بربادیوں کے مشورے آسمانوں میں ہو رہے ہیں :

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

وہ ان بکھرے دانوں کو ایک لڑی میں پرونے کے خواہاں تھے ۔ اگر ان کی کوشش کارگر نہ ہوئی تو :

دکھا دوں گا میں اے ہندوستاں رنگِ وفا سب کو
کہ اپنی زندگی کو تجھ پہ قرباں کرکے چھوڑوں گا

غرض اس زمانے کی بے تابی ، بے کلی ، سرگرانی اور پریشانی ایک لازمی پیش خیمہ تھی اس آنے والے فلسفیت اور سکون کے دور کی جب اقبال یورپ جاکر یہ کہنے کے قابل ہوسکے کہ ان کی "نگاہ تیز دلِ وجود کو بھی چیر گئی" ۔ ان کی "نوائے عشق سے حریم

ذات میں شور" بپا ہوا اور "بت کدۂ صفات میں الاماں کے غلغلے" گونج اٹھے ۔ فطرت کا ہر منظر ایک راز کا حامل تھا ۔ حسن و عشق ان کے لیے خاص کیفیّات سے لبریز تھے ۔ حسن اور عشق متحد ہوئے



علامہ اقبال ـــــ ۱۹۲۲ء

جا رہے تھے ۔ رفتہ رفتہ ہر چیز ان کے لیے عشق کی پیامبر بن گئی ۔ لیکن یہ عشق محض عشق تک رک نہیں گیا تھا ، اس میں عمل کا درس بھی موجود تھا ۔ "مور ناتواں" سے وہ "لطفِ خرام" سیکھتے تھے اور چاند بھی انھیں یہی کہتا سناتا دیتا تھا :

چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا ، کچل گئے ہیں

ناکامی اور موت ان کو ہیچ معلوم ہوتی تھی اور ان کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ چیزیں عمل کے لیے سدِّ راہ نہیں ہو سکتیں ۔

یورپ جا کر انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں وطن کی محبت نے لوگوں کی آنکھوں پر کچھ ایسی خود غرضی کی پٹی باندھ رکھی ہے کہ انھیں دوسری قوموں کے دکھ درد سے کوئی واسطہ ہی نہیں ۔ رات دن اسی فکر میں مبتلا رہتے ہیں کہ دنیا بھر کی دولت سمیٹ کر اپنا گھر بھر لیں ۔ یورپ والوں کی اس آپا دھاپی سے ان کے دل پر بڑی چوٹ لگی اور انھیں خیال آیا کہ اگر سب انسان ایک ہی کنبے کے فرد ہیں تو پھر ان میں اتنا تفاوت کیوں ہے ؟ یہ لوٹ کھسوٹ کب تک جاری رہے گی ؟ کیا انسان کی زندگی کا مقصد یہی ہے جو یورپ کی قوموں کے سامنے ہے ؟

ان کی طبیعت کی یہ بے چینی اُس زمانے کی کئی نظموں میں نظر آتی ہے ۔ مثلاً وہ ایک نظم میں کہتے ہیں :

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے
انساں کو راز جو بنایا   راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بے تاب ہے ذوق آگہی کا   کھلتا نہیں بھید زندگی کا

دوسری نظموں میں بھی جگہ جگہ اس طلب اور تلاش کا ذکر آیا ہے ۔ مثلاً :

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نگہ کو نظّارے کی تمنّا ہے   دل کو سودا ہے جستجو کا

آہستہ آہستہ یہ اُلجھنیں آپ ہی آپ دور ہوتی گئیں ۔ پردے سرکنے

لگے ، بھید کھلتے گئے ، دل میں جو سوال بار بار اٹھ رہے تھے ، ان کا جواب ملتا گیا اور شاعر کی بے چین روح کو تسکین سی ہونے لگی۔

اس زمانے کی آخری نظموں میں ان سوالوں کا پورا پورا جواب تو نہیں ملتا لیکن کہیں کہیں ہلکے ہلکے اشارے ضرور ہیں ۔ سب سے بڑی سوچ تو اس بات کی تھی کہ کیا یورپ والوں کی آپا دھاپی اور نفسا نفسی کا یہی عالم رہے گا ؟ خدا کی زمین پر یونہی لوٹ کھسوٹ ہوتی رہے گی ؟ طاقت ور اسی طرح کمزور پر ظلم کرتا رہے گا؟ کیا دنیا کو ان مصیبتوں سے بچانے کا کوئی طریقہ نہیں ؟ مگر جب اسلام کی تعلیم پر غور کیا تو یہ پریشانی آپ ہی آپ دور ہو گئی ۔ جی نے کہا کہ یہ چیزیں اب چند دنوں کی مہمان ہیں ۔ زمانہ بدلے گا اور تہذیب کا یہ ملمع ، جس کی چکا چوند پر انسان کی آنکھ نہیں ٹکتی ، آپ ہی آپ اتر جائے گا ۔ اسلام کے اصول ملکوں ملکوں پھیلیں گے اور جو خیالات مدت سے سینوں میں دبے ہوئے ہیں ، ہر کوچے اور ہر بازار میں سنائی دیں گے ۔ یہ خیالات انھوں نے اپنی ایک نظم میں نہایت جوش کے ساتھ یوں بیان کیے ہیں :

دیارِ مغرب کے رہنے والو ! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو ، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ، ناپائیدار ہوگا

اس نظم کے ایک شعر سے تو اقبال کے اس فیصلے کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اب وہ مسلمانوں کے جذبات کو ابھارنے اور اپنی گری ہوئی قوم کو اٹھانے پر اپنی شاعری کی ساری قوت صرف کردیں گے :

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری ، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

یہ سوچنے کے بعد انھوں نے مسلمانوں کے فسادِ مزاج کی اصلاح اور غلامی سے ان کی نجات کے لیے ایک لائحۂ عمل مرتّب کیا اور اپنی قوم کو دعوت دی :

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں ، دیدۂ اغیار کو بینا کردیں

انھیں پختہ یقین تھا کہ مسلمانوں کا مستقبل نہایت شاندار ہے اور دنیا کی امیدوں کا مدار انھی پر ہے ۔ انھوں نے قوم کو توحید ، اخوت عمل اور عشق کا سبق دیا اور سب سے زیادہ اس بات پر زور دیا کہ ان کی قوم اپنے آپ کو پہچانے ، خود اعتمادی سیکھے ، اپنی خودی کو صحیح طور پر سمجھے اور ایسے اصولوں پر گام زن ہوجائے جو اسے ترقی کی معراجِ کمال تک پہنچا دیں ۔ وہ صبر و توکّل ، تسلیم و رضا اور فقر و قناعت کے پوشیدہ معنی اور اغراض کے گورکھ دھندے توڑ کر پھینک دیتے ہیں اور ان کی اصلی غرض و غایت اور ان کے صحیح استعمال کی جانب قوم کو راغب کرتے ہیں ۔ سوز و سازِ رومی اور پیچ و تابِ رازی کی کشمکش کے اس دور میں بھی اقبال نے جو کچھ کہا ، قوم و ملک اور دنیا کو جو پیغام دیا ، اگرچہ اُس کا ذریعہ شاعری ہے ، تاہم اقبال کا شعر ، ان کی رائے اور ان کے فکر و خیال کا حامل ہے ۔

خودی کا تصور :

اقبال کا فکر انسانیت کے ہر شعبے پر حاوی ہے ۔ دین ، مذہب ، اخلاق ، تمدّن ، معاشرت اور سیاست سب اس میں سمائے اور سموئے ہوئے ہیں ۔ اقبال کے اس نظامِ فکر اور حکیمانہ تعلیمات کا سرچشمہ صرف ایک تصوّر ہے جسے انھوں نے "خودی" کا نام دیا ہے ۔ ان کے باقی تصوّرات اسی ایک تصوّر کے گرد گھومتے ہیں ، اسی کے حاصلات و مضمرات ہیں اور اسی سے علمی اور عقلی طور پر وابستہ ہیں ۔

اس تصوّر کو "خودی" کا نام دینے کے سلسلے میں اقبال کو سخت کشمکش سے دوچار ہونا پڑا ۔ انھوں نے "خودی" کے لفظ کو نئے معنی پہنائے اور سب کو چونکا دیا ۔ اقبال خود کہتے ہیں :

"خودی کا لفظ انتہائی پس و پیش کے بعد اور بہ امرِ مجبوری انتخاب کیا گیا تھا ۔ ادبی نقطۂ نظر سے اس میں بہت سی خامیاں

نظر آتی تھیں اور اخلاق لحاظ سے اُردو اور فارسی دونوں میں
یہ لفظ غرور اور تکبّر کے برے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔
مابعدالطبیعیات میں دوسرے الفاظ ، جو "مَیں" کی جگہ استعمال



علامہ اقبال ـــــ ایک پورٹریٹ

ہو سکتے تھے ، وہ بھی اتنے ہی برے تھے جیسے آنا ، شخص ، نفس ، انانیت ۔ ضرورت یہ تھی کہ نفسِ انسانی کا مفہوم ادا کرنے کے لیے کوئی ایسا بے رنگ لفظ ملے جس کی اخلاق حیثیت کوئی نہ ہو ۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ، اُردو اور فارسی میں ایسا کوئی لفظ موجود نہیں ۔ فارسی کا لفظ "مَن" بھی ایسا ہی برا ہے ۔ تاہم شعری مقتضیات کے لیے میں نے خیال کیا کہ "خودی" کا لفظ سب سے زیادہ موزوں ہے ۔ فارسی زبان میں چند شواہد ملتے ہیں کہ لفظ "خودی" نفس کے سادہ معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ گویا کہا جاسکتا ہے کہ "مَن" کا بدل یہی بے رنگ لفظ ہے ۔ اسی طرح مابعدالطبیعیات میں "خودی" کا لفظ "مَن" کے اُس ناقابلِ تشریح احساس کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے جو ہر شخص کی شانِ یکتائی کی اساس ہے ۔ الٰہیّات میں اس کی اخلاق حیثیت اُن لوگوں پر واضح نہیں ہوتی جو اخلاق اہمیت سے رہائی پانا نہیں چاہتے ۔ میں "زبورِ عجم" (صفحہ ۲۷) میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں :

گرفتم ایں کہ شرابِ خودی بسے تلخ است
بدردِ خویش نگر ، زھرِ ما بدرماں کش

(یعنی میں تسلیم کرتا ہوں کہ خودی کی شراب بلاشبہ بہت تلخ ہے لیکن میرا مشورہ یہی ہے کہ تو اپنے مرض کا اندازہ لگا اور میرا زہر شفا کے لیے استعمال کر) ۔

جب میں نفیِ ذات کی مذمّت کرتا ہوں تو اس سے میرا مطلب اخلاق نقطۂ نظر سے اپنی ذات کا انکار نہیں ہوتا ۔ ضبطِ نفس اخلاق نقطۂ نگاہ سے "آنا" کے لیے طاقت کا سرچشمہ ہے ۔ نفیِ ذات کی مذمّت کرتے ہوئے میں اخلاق کی اُن صفات کی مذمّت کرتا ہوں جو "آنا" کے فنا ہونے کی طرف رہنمائی کرتی ہیں ۔ اور "آنا" سے مراد الٰہیّات کی قوت ہے کیونکہ اس کے فنا ہونے کے معنی اس کی موت اور ذاتی کمزوریوں کی ناقابلیت

ہے۔ اسلامی تصوّف کا مقصد میری دانست میں "انا" کو فنا کرنا نہیں کیونکہ اسلامی تصوّف میں فنا سے مراد عدمِ وجود نہیں بلکہ کلّی طور پر انسانی انا کا اللہ تعالیٰ کی خودی کو تسلیم کرنا ہے۔ اسلامی تصوّف کا نصب العین یہ ہے کہ اس منزل کے بعد ایک اور درجہ ہے، گویا فنا کے بعد بقا کا مقام ہے، جو میرے نقطۂ نظر سے اثباتِ ذات کا سب سے ارفع مقام ہے۔ جب میں یہ کہتا ہوں:

پختہ مثلِ سنگ شو، الماس باش

(الماس کی طرح سخت ہو جاؤ) تو میرا مطلب اس سے وہ سختی اور شقاوت نہیں ہوتا جو نٹشے کے پیشِ نظر ہے — یعنی رحم اور انسانی ہمدردی کو ترک کر دیا جائے — میرا مفہوم انا کے عناصر کی تکمیل ہے تاکہ وہ اس قابل ہو جائے کہ اپنی بساط بھر تمام ہلاکت خیز طاقتوں کو شکست دے سکے جو ذاتی کمزوریوں پر منتج اور شخصی بقا کے حصول میں مزاحم ہوتی ہیں۔

اخلاقی نقطۂ نظر سے میں نے "خودی" کا لفظ خود اعتمادی، خود داری، عزّتِ نفس اور حفاظتِ نفس کے مفہوم میں استعمال کیا ہے، یہاں تک کہ اثباتِ ذات یا اپنے حق پر اصرار کرنے کے معنوں میں بھی، خاص کر اس صورت میں جب زندگی کی خاطر فرض، انصاف اور سچائی کی حمایت میں ڈٹ کر موت کا مقابلہ کرنا پڑے۔ میرے خیال میں یہ رویّہ عین اخلاق ہے، کیونکہ یہ انا کی قوتوں کو مجتمع کرنے میں سازگار ہوتا ہے۔ یہ جفاکشی ہے انتشار اور تحلیل کی قوتوں کے خلاف۔ عملاً الٰہیّاتی انا دو بڑے حقوق کی حامل ہے، یعنی زندہ رہنے کا حق اور آزادی کا حق، جن کا تعیّن الٰہی قوانین میں ہوچکا ہے۔"

شروع شروع میں لوگوں نے اس تصوّر کی مخالفت کی اور خودی کے معنوں پر بھی اعتراضات کیے، مگر آخر سب نے تسلیم کرلیا اور

اب یہ سکّۂ رائج الوقت ہے۔ اقبال کو دعوت کے اس مقام پر پہنچنے کے لیے کتنی مدت ریاضت کرنی پڑی، اس کا حال بھی انھی کی زبانی سنیے۔ نہایت انکسار سے فرماتے ہیں:

"اگرچہ میں کوئی غیر معمولی ذہانت و فطانت رکھنے والا آدمی نہیں ہوں اور نہ کوئی غیر معمولی علم رکھتا ہوں، تاہم عام لوگوں سے علم اور سمجھ کچھ زیادہ رکھتا ہوں۔ جب مجھ کو اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے بیس سال کی ضرورت ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ عام لوگ، جو دنیا کی دماغی اور علمی تاریخ سے واقف نہیں، تھوڑے غور و فکر سے اس کی حقیقت تک پہنچ جائیں ـــ اعتراض کرنا دوسری بات ہے ـــ مسئلہ نہایت دقیق اور گہرا ہے، اور چونکہ اس کا تعلق انسان کی موجودہ اور مابعدالموت کی زندگی سے ہے، اس واسطے ہر ایک آدمی کے لیے کسی نتیجے پر پہنچنا ضروری ہے۔ میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں، وہ نتیجہ بیشتر اقوامِ مشرق کے موجودہ مذاق اور میلانِ طبیعت کے خلاف ہے لیکن مشرق کے حکما اس سے ناآشنا نہیں۔ اور یہ کہنا تو سراسر غلط ہے کہ میں اس نتیجے پر پہنچنے میں فلاسفۂ مغرب سے متاثر ہوا ہوں۔"

(بنام مہاراجہ کشن پرشاد، ۱۰ مئی ۱۹۱۶ء)

یہاں پہنچ کر اقبال کو معلوم ہوگیا کہ ان کی زندگی کا اصل مشن کیا ہے۔ اقبال کو اپنے اس پیغام کی کامیابی پر یقین کامل تھا۔ چنانچہ ۱۴- اپریل ۱۹۱۶ء کے ایک اور خط میں مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھتے ہیں:

"یہ مثنوی، جس کا نام "اسرارِ خودی" ہے، ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سکر و مستی و بے خودی کی طرف ہے، مگر قسم ہے اس خدائے واحد کی جس کے قبضے میں میری جان و مال و آبرو ہے، میں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی

ہدایت ہوئی ہے ۔ اور میں حیران ہوں کہ مجھ کو ایسا مضمون لکھنے کے لیے کیوں انتخاب کیا گیا ! جب تک اس کا دوسرا حصہ (یعنی "رموزِ بیخودی") ختم نہ ہو لے گا ، میری روح کو چین نہ آئے گا ۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہے کہ بس میرا یہی ایک فرض ہے ، اور شاید میری زندگی کا اصل مقصد بھی یہی ہے ۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کی مخالفت ہو گی ، کیونکہ ہم سب انحطاط کے زمانے کی پیداوار ہیں اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے تمام عناصر و اجزا و اسباب کو اپنے شکار (خواہ وہ شکار کوئی قوم ہو ، خواہ فرد) کی نگاہ میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے ، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بدنصیب شکار اپنے تباہ و برباد کرنے والے اسباب کو اپنا بہترین مربّی تصور کرتا ہے ، مگر : ع

من صدائے شاعرِ فرداستم

اور :

نا امیداستم ز یارانِ قدیم
طورِ من سوزد کہ می آید کلیم

نہ معترض رہے گا ، نہ اقبال ۔ یہ بیج جو مردہ زمین میں اقبال نے بویا ہے ، اُگے گا ، ضرور اُگے گا اور علی الرغمِ مخالفت بارآور ہو گا ۔ مجھ سے اُس کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے ۔ الحمد للہ ۔"

اقبال کا یہی وہ زندگی افروز پیغام تھا جو ہمارے دلوں میں اُتر کر خون کے ساتھ گردش کرنے لگا ۔ مدّتوں کی سوئی ہوئی قوم جاگ اُٹھی ، اس میں تازہ ولولہ اور خود اعتمادی کا جذبہ اُبھرا اور بیدار ہوا ۔ وہ غلامی کا جوآ اپنے کندھوں سے اُتار کر آزاد ہو گئی اور طاقت و حکومت کی مالک بن گئی ۔ پاکستان اسی خواب کی تعبیر ہے ۔ آزاد قوم کی حیثیت سے بھی ہمارا مقصود و منتہا اُنھی کیفیات کی بازآفرینی ہے جو شاعر پر گزری تھیں اور اُسی پیغام کو عملی جامہ پہنانا ہے جو اقبال نے ہمیں دیا تھا ۔

